مواعظِ ثلٰثہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

راحت القلوب

ملتِ ابراہیم

طریق القلندر
مع رسالہ
قصد السبیل

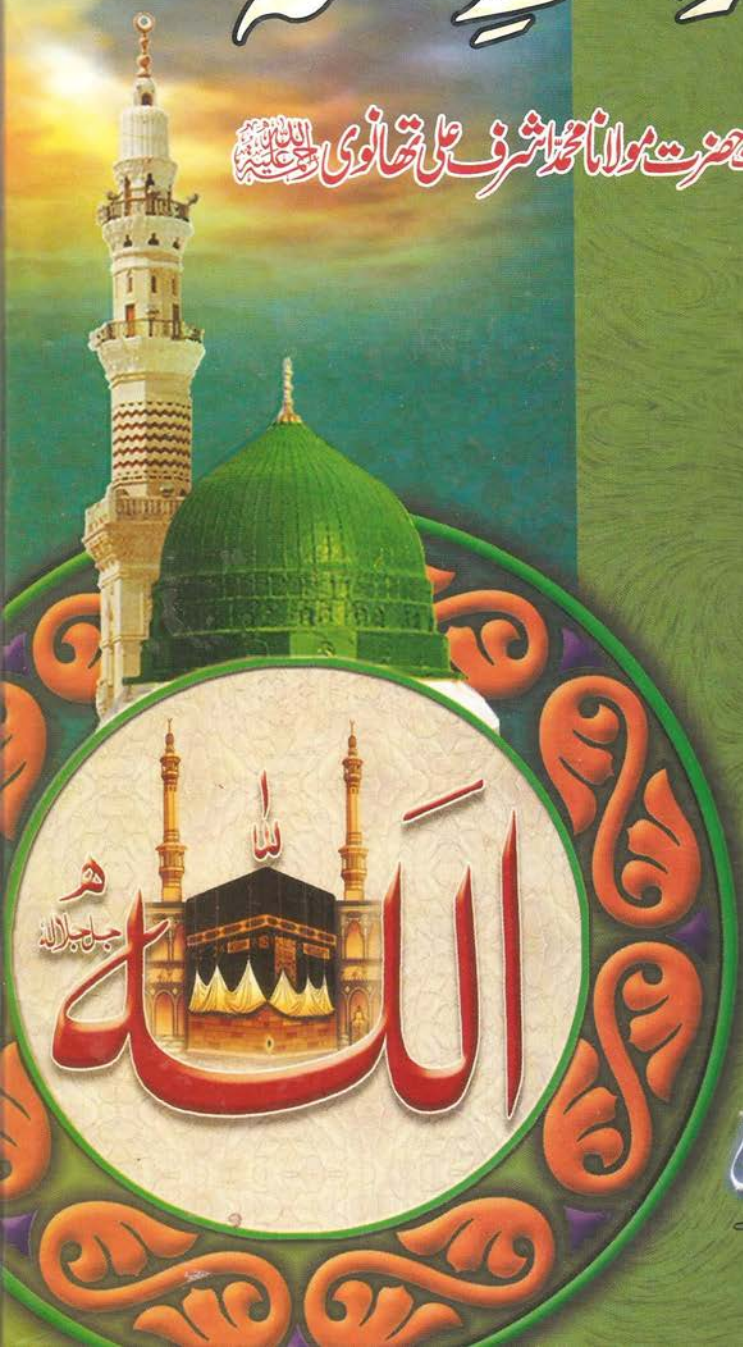

کتب خانہ مظہری
گلشن اقبال کراچی پاکستان

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

ملّتِ ابراہیم

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

کتب خانہ مظہری

گلشن اقبال ۲ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

الوعظ المسمّٰی بہ

مِلّتِ ابراہیم

نام وعظ	مقام وعظ	تاریخ ویوم	وقت	تعداد سامعین
[illegible]	سورتی جامع مسجد رنگون	جمعہ ۹ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۲ جنوری ۱۹۲۰ء	[illegible]	[illegible] دو ہزار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہوا اور ہم نے اُن کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں سے ہیں۔ جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار

کرو انھوں نے عرض کیا میں نے اطاعت کی رب العالمین کی) جس آیت کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس میں ایک خاص مضمون موجود ہے جسے باقتضائے وقت بیان کے لئے اختیار کیا گیا ہے اور وہ مقتضائے وقت یہ ہے کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ رنگون میں میرے حاضر ہونے کا یہ سب سے پہلا موقع ہے۔ اس سے قبل نہ میرا یہاں کوئی بیان ہوا نہ یہاں میرے حاضر ہونے کا کبھی اتفاق ہوا اور جب حاضری ہی کا اتفاق نہیں ہوا تو موقع بیان کا تو کیا ملتا۔ تو گویا یہ اوّل بیان ہے میرا اس مقام پر۔ اس لئے جی یوں چاہتا ہے کہ ایسے مضمون کے متعلق بیان کیا جائے جو سب میں اولیت کا استحقاق رکھتا ہو اور یہ تو ظاہر بات ہے کہ ہم لوگوں کی حالت کے مناسب بیان ہے تو دین ہی کا ہے تو دین کے اجزاء میں جو سب سے اوّل مقدم جزو ہو اس کو اس وقت بیان کرنا زیادہ زیبا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دین میں اجزاء مختلف ہیں۔ یعنی کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اصول ہمیشہ قابل تقدیم ہوا کرتے ہیں اور مقدم ہوا کرتے ہیں فروع پر۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ ایک تیسری بات اور بھی ہے جو سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ خود اصول میں بھی دو درجے ہوا کرتے تھے۔ ایک تو اصول اور ایک اصل الاصول تو ضرور ہوا کہ دین کے اندر بھی سب قسم کے اجزاء ہوں بعض تو فروع کہنے کے قابل اور بعض اصول کہنے کے قابل پھر حسب قاعدہ مذکورہ جو اجزاء اصول کہنے کے قابل ہوں ان میں بھی ایک نہ ایک ایسی چیز ہونی چاہیے جو اُن اصول کی بھی اصل ہو اور جس کو اصل الاصول کہہ سکیں۔ اب رہی اس کی تعیین سو ہر شخص کو معلوم ہے کہ دین کے اندر اصل الاصول کیا چیز ہے ظاہر بات ہے کہ وہ ایسی چیز ہو گی جس کے مقابلہ میں نہ کوئی اصل معتد بہ درجہ رکھتی ہو نہ کوئی فرع یہ سب مقدمات بالکل ظاہر ہیں۔ اس کے بعد میں اپنے مسلمان

بھائیوں کے فقط ایک اجماعی عقیدہ کو نقل کئے دیتا ہوں۔ اس سے خود تعیین اس اصل الاصول کی ہو جائے گی۔ یہ عقیدہ اجماعی ہے اور منصوص ہے اور منصوص بھی نص قطعی کہ بدون اسلام کے کوئی طاعت مقبول نہیں۔ جب طاعت پر مقبولیت ہی مرتب نہ ہوئی تو کوئی چیز معتدبہ نہ ہوئی اس کو سب مسلمان مانتے ہیں کسی سے خلاف وارد نہیں اور اگر کوئی خلاف کرے بھی تو وہ مسلمان نہیں کیونکہ نص قطعی کا انکار ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اس کی تصریح فرمادی ہے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ دین اس سے (نزد خدا) مقبول نہ ہوگا) اس آیت میں تو صاف نفی کر دی ہے دوسرے ادیان کے مقبول ہونے کی۔ دوسری آیت میں گو عنوان مختلف ہے لیکن معنون یہی ہے ارشاد ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہے اس میں بھی نفی ہے دیگر ادیان کی صحت کی اس کے علاوہ جا بجا جہاں اعمال کے نافع ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ قیدیں بھی مذکور ہیں وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ یہ قیدیں تصریحاً ظاہر کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بدونِ اسلام کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا عمل کرے لیکن مسلمان نہ ہو تو وہ عمل کچھ بھی نہیں کوئی لاکھ مجاہدے ریاضت کرے مگر مسلمان نہ ہو تو کوئی معتدبہ نتیجہ نہیں کیونکہ اس کی عبادت کے اندر کوئی مقبولیت نہیں چنانچہ خود حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ ایسوں کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب ناکارہ ہوگا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے اثر ہے) غرض یہ بالکل ایسا

ہے جیسا کہ اہلِ عقل خوب سمجھتے ہیں کہ کسی شخص میں اگر سلطنت وقتیہ کی اطاعت نہ ہو تو اس کے سارے کمالات گرد اور ہیچ ہیں۔ بس اسی کے درجہ میں یہ امر ہے جو میں عرض کر رہا ہوں ہر چند۔ اس مثال کی کوئی ضرورت اور حاجت نہ تھی کیونکہ مثال توضیح کے لئے ہوا کرتی ہے سو اس مسئلہ میں کون سا خفا تھا جو اس کی توضیح کے لئے اس مثال کی ضرورت واقع ہوئی مگر ضرورت اس مثال کی یہ ہوئی کہ آج کل کچھ ایسا مذاق بگڑا ہے کہ ایسی موٹی بات میں بھی شبہ پیدا ہونے لگا ہے جو عقیدے کے درجہ میں گو نہ ہو لیکن رائے کے درجہ میں ضرور ہے وہ شبہ مجھے اس وقت یاد آ گیا اور وہ شبہ ہی محرک ہوا اس کا کہ اس مثال سے اس کو رفع کیا جائے بعض خطوط میرے پاس آئے ان میں یہ شبہ پیش کیا گیا تھا کہ صاحب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان نہ ہو اس میں سارے کمالات موجود ہوں لیکن اس کو نجات نہ ہوگی۔ تو بعض مدعیان عقل نے یہ شبہ پیش کیا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص میں تمام کمالات موجود ہیں سخاوت بھی مروّت بھی ایثار بھی قومی ہمدردی بھی۔ آج کل بس یہ اخلاق شمار کئے جاتے ہیں۔ اور آج کل بڑی تہذیب ان اخلاق ہی کو سمجھا جاتا ہے اور عقاید کو عقیدۃً تو نہیں لیکن حالاً دائرہ مفہوم تہذیب سے گویا خارج ہی کر دیا ہے بلکہ عقائد کے اندر تو اپنے آپ کو بالکل مختار ہی سمجھ لیا ہے سمجھتے ہیں کہ عقیدہ تو محض خیال کا نام ہے اور خیال کو بھلا کیا دخل نجات میں عقائد کو تو یوں غیر ضروری قرار دے لیا ہے اعمال سو اعمال کو کسی درجہ میں ضرور موثر سمجھتے ہیں مگر ان میں بھی سب اعمال نہیں محض چند اعمال جن کا نام اخلاق رکھ لیا ہے اور انھیں کو مدار ٹھیرا دیا ہے ترقی اور کمال کا اور انھیں اخلاق کا نام تہذیب رکھا ہے اور ان کے یہ نام ہیں ترحم ایثار ہمدردی نفع رسانی حُبِّ قومی۔ بس ان چند اخلاق میں تہذیب کو منحصر سمجھ کر شبہ پیش کر دیا کہ ایک شخص سب بزرگوں کی تعظیم تکریم بھی کرتا ہے۔ کسی نبی کی اہانت بھی نہیں کرتا کسی

کا دل بھی نہیں دُکھاتا۔ داد و دہش بھی کرتا ہے مگر فقط رسالت کا منکر ہے گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی بھی نہیں کرتا۔ اور خدا کو بھی مانتا ہے یا خدا کو بھی نہیں مانتا تو یہ کہا جائے گا کہ صرف دو مفروض کمالات نہیں ہیں پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ان دو مفروض کمالات کے نہ ہونے سے اس کے سارے کمالات پر کیسے خاک ڈال دی جائے گی اور اس کو جہنّم میں ٹھونس دیا جائے گا یہ تو بڑی بے رحمی کی بات ہے اور شبہ کو اس سے قوی کرتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ایک ایسا شخص ہے جو نہ حلال حرام کی پروا کرتا ہے نہ فرائض کو ادا کرتا ہے۔ نہ نماز کا نہ روزہ کا بلکہ پرلے درجہ کا فاسق و فاجر اور بدکار غرض تمام اعمال اور اخلاق اس کے خراب مگر ہے مسلمان تو کہتے ہیں کہ صاحب چونکہ مسلمان ہے اس لئے کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور جائے گا خواہ کُٹ کر پٹ کر ہی جائے مگر جائے گا ضرور۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا یوں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں لیکن بظاہر یہ معاملہ خدا کی شان کے خلاف ہے یہ تو بالکل تعصب معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ شبہ پیش کرتے ہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کیسے افسوس کی بات ہے۔ یہ شبہ ان لوگوں کی زبان اور قلم سے نکلتا ہے جو اپنے کو سچّا اور پکّا مسلمان بلکہ قوم کا لیڈر اور مصلح خیال کرتے ہیں وہ شبہات پیش کرتے ہیں۔ سو حضرت میں ان شبہات کا راز بتلا دوں۔ جو جاہل ہو کر اپنے کو محقق سمجھے گا وہ ایسی ہی خرابی میں پڑے گا حضرات محققیت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بہت بڑی چیز ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ ساری خرابی ان کی دعوئے محققیت کا نتیجہ ہے یعنی انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم محقق ہیں حالانکہ لوازم میں سے محققیت کے یہ سمجھنا بھی ہے کہ ہم محقق نہیں ہیں۔ جب علم و کمال کے ساتھ یہ اعتقاد نہ رہے کہ ہم محقق ہیں تب کہیں جا کر انسان محقق ہوتا ہے۔ اگر یہ لازم منفی ہے تو محقق شدن بھی منفی ہے چاہے عالم فاضل ہی کیوں نہ ہو۔ اور چہ جائیکہ عالم فاضل بھی نہ ہو چنانچہ

آج کل جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں ان کا مبلغ علم بھی تو کچھ نہیں۔ بس کچھ تاریخیں پڑھ لیں کچھ فلسفہ پڑھ لیا اور سمجھنے لگے کہ ہم بہت بڑے محقق ہیں۔ جب اپنے نزدیک محقق ہو گئے تو پھر یہ خیال غالب ہو گیا کہ جو ہماری رائے کے خلاف ہے وہ واقع اور تحقیق کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ جو چاہا شبہ پیش کر دیا چنانچہ یہ بھی ایک شبہ پیش کر دیا جو میں نے عرض کیا۔ میں نے اس لئے اس مثال کی ضرورت سمجھی کہ یہ شبہ رفع ہو جائے ورنہ فی نفسہ یہ مسئلہ بالکل صاف تھا اور محتاجِ مثال نہ تھا۔ تقریر یہ ہے کہ اس مثال کے انطباق کی کہ میں صاحبِ اعتراض اور صاحبِ شبہ سے گورنمنٹ کا قانون پوچھتا ہوں کہ ایک شخص ہو نہایت رقیق جس کو تمام کمالات اعلیٰ درجہ کے حاصل ہوں مگر باغی ہو یعنی سلطنت کی اطاعت نہ کرتا ہو اس کی سزا کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس کی سزا پھانسی ہے یا عبور دریائے شور یا حبس دوام اب ایک شخص ایسے مجرم کے مقدمہ کی پیشی کے وقت عدالت میں حاضر ہے جج صاحب نے سزائے حبس دوام کا حکم سُنایا آپ نے سُنا سُن کر آپ نے پوچھا کیوں صاحب اس پر کیا الزام لگایا گیا ہے اور کون سی دفعہ قائم کی گئی ہے جو اس قدر سخت سزا تجویز کی گئی۔ جج صاحب نے کہہ دیا اس نے بغاوت کا جرم کیا ہے اس لئے اس کو حبس دوام کی سزا دی گئی ہے یہ سُن کر آپ کیا فرماتے ہیں۔ حضور کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص ایم اے ایل ایل بی ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کئے ہوئے ہے انگریزی ایسی جانتا ہے کہ انگریز بھی نہیں جانتے۔ جج صاحب نے کہا ہاں معلوم ہے۔ پھر کہا حضور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص سائنس کا بھی بڑا ماہر ہے۔ اس نے وہ وہ صنعتیں ایجاد کی ہیں کہ اہلِ یورپ بھی دنگ ہیں۔ کہا ہاں سب معلوم ہے۔ پھر کہا بڑے ہی غضب کی بات ہے اور بڑی بے انصافی ہے کہ اس کی ساری لیاقتیں پس پشت ڈال دی گئیں اور ساری قابلیتیں خاک میں ملا دی گئیں فقط اتنی سی بات پر کہ باغی ہے حبسِ دوام کی

سزا دے دی گئی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جج کے اس حکم پر کبھی وسوسہ بھی ذہن میں نہ آئے گا کہ ایسی سخت سزا انصاف کے خلاف ہے یا ترحم کے خلاف ہے۔ کیونکہ سمجھ لوگے کہ بغاوت جرم ہی ایسا ہے جس کی یہی سزا ہونی چاہیئے۔ اگر اس صاحب شبہ کو جج کے فیصلہ پر بھی وسوسہ آتا تو خیر یہ کہا جا سکتا تھا کہ بے چارہ کیا کرے اس کی سمجھ ہی موٹی ہے اس لئے جو وسوسہ خدا پر پہونچا وہی جج پر بھی پہونچا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ جج کے فیصلے پر تو کبھی وسوسہ نہ آیا اور خدا نے جو اسی کے مثل فیصلہ فرمایا اس پر شبہ پیش کر دیا گیا۔ پھر لے صاحبو! یہ کیسا ایمان ہے اور یہ کیسا اسلام ہے کہ اس شخص کے نزدیک جج کا فیصلہ تو عقل کے قریب اور خدا کا فیصلہ عقل سے بعید

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں) ایک شخص سلطنت سے بغاوت کرے تو اس کے سارے اعمال اور اس کی ساری خوبیاں ضبط ہونا تو معقول جو خدا سے بغاوت کرے اس پر شبہ اور اس شبہ کے جواب کے بعد ایک شبہ اور کیا جاتا ہے کہ خیر یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اگر خدا سے بغاوت کرے تو واقعی اس کے سارے اعمال حبط ہی ہو جانے چاہئیں لیکن اگر کوئی خدا کو بھی مانتا ہو مگر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتا ہو تب تو اعمال کے حبط ہو جانے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی۔ اور اس شبہ میں بہت سے لوگ مبتلا پائے گئے کہ وہ انکارِ رسالت کو کفر نہیں سمجھتے میں کہتا ہوں کہ اوّل تو نصوص قطعیہ اس کی تکذیب کرتی ہیں اور جن نصوص سے یہ شبہ واقع ہوا ہے اُن کی صحیح تفسیر ان لوگوں نے نہیں سمجھی یہ تو کلام ہے نقل و تحقیق کی حیثیت سے باقی عقل و الزام کی حیثیت سے یہ جواب ہے کہ جو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا۔ وہ واقع میں خدا کو بھی نہیں مانتا اور مان بھی نہیں سکتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ خدا کے ماننے کے معنے کیا ہیں ظاہر ہے کہ خدا کو ماننا اسے کہتے ہیں کہ جیسا خدا ہو ویسا ہی اسے اعتقاد کرے۔ اگر

کسی نے اور طرح کا مان لیا تو اس نے خدا کو نہیں مانا بلکہ اپنے خیال کو مانا مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں بادشاہ کو مانتا ہوں۔ اور کوئی پوچھے کہ خبر بھی ہے بادشاہ کیسا ہے اور وہ کہے کہ اس کے ایک آنکھ ہے ایک ٹانگ ہے ہاتھ دونوں کٹے ہوئے ہیں حالانکہ بادشاہ دراصل بہت حسین و جمیل ہے اور اس میں کوئی نقص یا عیب نہیں ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا۔ بادشاہ کو کہاں مانا۔ بادشاہ تو نہایت حسین و جمیل ہے اور سب نقائص سے پاک ہے۔ اس نے تو اپنے خیال سے ایک نیا بادشاہ تصنیف کر لیا ہے اور اس کو مانا ہے تو خدا کے ماننے کے یہ معنے ہیں کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اسے مانے یعنی تمام کمالات کے وجود کا اس میں اعتقاد رکھے اور چونکہ منجملہ کمالات کے ایک کمال سچا ہونا بھی ہے اس لئے اگر خدا کو سچا نہ مانے تو یہ بھی خدا کا نہ ماننا ہی ہوا بلکہ انکار ہی ہوا۔ جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لہٰذا جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا تو خدا کو جھوٹا سمجھا اور اس کے ایک کمال کا انکار کیا یعنی سچے ہونے کا ان سب مقدمات سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ جب کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانا تو وہ خدا سے باغی ہوا اور اس کو تسلیم ہی کر لیا گیا ہے کہ جس نے خدا سے بغاوت کی وہ مستحق ہے عذاب ابدی کا۔ تو صاحبو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باغی ہونا مستلزم ہے خدا سے باغی ہونے کا اور اس کا جرم عظیم ہونا اوپر مذکور ہو چکا ہے اسی طرح غیر باغی مجرموں کی سزا میں یا اعتراض اور وسوسہ بھی کسی کو نہیں ہوتا کہ صاحب فلاں مجرم تھا اس نے جوا کھیلا تھا یا ڈکیتی کی تھی یا چوری کی تھی اس کو بھی سزا تو دی مگر اس کی برابر نہیں جس نے بغاوت کی تھی دو برس کی قید بھگت کر پھر رہا ہو گیا اور پھر آ کر اپنے بیوی بچوں کی صورت دیکھ لی تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کھلی ہوئی بدتہذیبی کے افعال کے مجرموں کے

ساتھ تو ایسی نرمی برتی گئی جن کے اعمال اور اخلاق سب نہایت ناگفتہ بہ اور ایک شخص اتنا صاحبِ کمال اور ذی لیاقت دوجاہت اور اس کو سزائے حبس دوام دے دی گئی اور دوسرے مجرموں کو بھی قید کی سزا تو دی گئی لیکن ان کی سزا میں ایک ایسی میعاد بھی ہے جس کے بعد رہائی ہو جائے گی لیکن یہ بے چارہ باغی کبھی رہا ہی نہ ہوگا ساری عمر جیل خانہ ہی میں گذرے گی۔ ہمیشہ کے لئے اپنے دوست احباب بیوی بچوں سے جُدا کر دیا گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے سو یہ شبہ کسی کو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو یہ شبہ ہو بھی اور جج سے کوئی یہ سوال بھی کرے تو وہ کیا کہے گا۔ یہی کہے گا کہ ان دونوں میں فرق ہے ایک گو قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے مگر صاحبِ قانون کی حکومت کو تو تسلیم کئے ہوئے ہے یعنی گورنمنٹ سے تو بغاوت نہیں کرتا اور دوسرا تو سرے سے گورنمنٹ ہی کو اڑانا چاہتا ہے گورنمنٹ کو گورنمنٹ ہی تسلیم نہیں کرتا تو اس دوسرے شخص کا جُرم کسی طرح قابلِ معافی ہے ہی نہیں کیونکہ یہ تو گورنمنٹ کے وجود ہی کو مٹانے کی فکر میں ہے اور پہلا شخص گو قانون کے خلاف کرتا ہے مگر صاحبِ قانون کو تو مٹانا نہیں چاہتا۔ بس وہ یہی جواب دے گا اب میں پوچھتا ہوں کہ اس کا یہ جواب معقول ہے یا نہیں۔ یعنی ہمارے معترضین کے نزدیک بھی معقول ہے یا نہیں ضرور معقول ہوگا کیونکہ سراسر ان کی عقل کے موافق ہے تو حیرت کی بات ہے کہ ایک جواب جج صاحب کے منہ سے نکلے تو وہ معقول اور وہی جواب مولویوں کے منہ سے نکلے تو وہ تشدد ہے تعصب ہے غلو ہے۔ بس نہ معلوم مولوی ہونا جرم ہے کہ جو ان کے منہ سے نکلے اُسے ضرور جھٹلانا خواہ وہ کیسے ہی ٹھکانے کی بات کہیں اور اگر وہی بات کسی جدید تعلیم یافتہ کے منہ سے نکلے تو فوراً آمَنَّا وَصَدَّقْنَا (ہم نے مان لیا اور یقین کر لیا) میرے ایک مخدوم فارسی کے استاد اپنا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ کسی حاکم نے ایک فیصلہ کیا جو اتفاق سے عالمگیریہ کے ایک جزئیہ کے موافق تھا گو عالمگیریہ کے جزئیہ کے بناء پر نہیں تھا مولانا موصوف نے کسی واقعہ کے متعلق ایک مسئلہ کسی مجمع میں بیان

فرمایا کہ عالمگیریہ میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے بڑے بڑے مدعیانِ عقل وہاں موجود تھے کسی نے التفات بھی نہ کیا مولانا تھے بڑے ظریف حاضرین سے فرمانے لگے کہ حال ہی میں ایسے ہی واقعہ کے متعلق ایک مقدمہ ہوا ہے صاحب کلکٹر کے یہاں انھوں نے بھی اسی کے موافق فیصلہ کیا ہے یہ سنتے ہی سب چوکنے ہو گئے اور اصرار شروع ہوا کہ ہاں صاحب ذرا فرمائیے تو کلکٹر صاحب نے کیا فیصلہ کیا۔ مولانا نے وہ فیصلہ بیان کیا جو کہ عالمگیریہ کے اس جزئیہ کے موافق تھا جس کو مولانا اس سے قبل بیان فرما رہے تھے اور کوئی التفات بھی نہ کرتا تھا۔ سب نے سُن کر تسلیم کیا۔ انھوں نے کہا کہ جناب یہ وہی تو بات ہے جو عالمگیریہ میں لکھی ہوئی ہے مگر عالمگیریہ پہلے معتبر نہ تھی اور اب انگریزی فیصلہ کی موافقت سے معتبر ہو گئی۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے صاحبو یہ تو حال ہے اور پھر کہتے ہیں کہ ہم لوگ مومن ہیں ہم مسلمان ہیں۔ یہ کیا ایمان ہے اور کیا اسلام ہے تو اس مذاق کے لوگ بھی اس زمانہ میں کثرت سے موجود ہیں اس لئے میں نے یہ مثال عرض کی تھی کہ اسلام کا مدارِ نجات ہونا ایسا ہی ہے جیسے سلطنت کا فرمانبردار ہونا مقبولیت کا مستحق بننا اور اگر ایسا شخص مجرم بھی ہے تو اپنے جرموں کی سزا بھگت بھگتا کر انجام کار براءت حاصل کر سکتا ہے یا بے سزا پائے ہی محض بطور مراحم خسروانہ کے بری کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف باغی کے جس کی سزا کے منقطع ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں بجز تصدیق حکومت واطاعت اور اعلانِ وفاداری کے۔ اب اس عقیدہ کو دیگر عقائد سے ملایا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ اگر کسی عقیدہ کا اصل الاصول نام ہونا زیبا ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔ تو اسلام کو اس طرح اوّلیت اور تقدم کا حق حاصل ہے اور چونکہ اس مقام پر یہ میرا قول بیان ہے اس لئے پہلے اوّل الاعمال ہی کا بیان کرنا زیادہ مناسب ہوا۔ یہ جو کچھ میں نے اب تک اسلام کی بابت بیان کیا ہے یہ تو علم وعقیدہ کے متعلق ہے جس میں

بفضلہٖ اکثر مسلمان غلطی سے محفوظ ہیں اور جو غلطی اس کے متعلق نو تعلیم یافتہ حضرات کرتے ہیں اس کو الحمدللہ بوجہ احسن رفع بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام کی بابت ہم لوگوں نے ایک عملی غلطی بھی کی ہے اس وقت زیادہ تر اس کا رفع کرنا مقصود ہے۔ وہ عملی غلطی یہ ہے کہ ہم سب کے سب اس کے معتقد ہیں کہ ہم مسلمان ہیں صاحبِ اسلام ہیں اور بحمداللہ یہ اعتقاد ایک حد تک سچا بھی ہے۔ مگر ایسا ہی سچا ہے جیسا کہ میں ایک مثال کے ضمن میں عرض کرتا ہوں۔ اے صاحبو! کیا کہا جائے ہزاروں غلطیوں میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مالدار کا ایک لفظ ہے اس کو ذہن میں محفوظ رکھ کر میرے سوالات کا جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے کسی کے پاس پانچ ہزار ہے کسی کے پاس پانچ لاکھ ہے کسی کے پاس ایک لاکھ ہے کسی کے پاس پچاس ہزار ہے۔ علیٰ ہذا اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ ان میں سے کس کو مالدار کہیں گے اور کس کو نہیں۔ آپ ضرور ہر ایک کی بابت یہی کہیں گے کہ علیٰ قدر مراتب یہ سب مالدار ہیں اور اگر آپ سے پوچھا جائے کہ سو روپیہ کے مالک کو بھی آپ مالدار سمجھیں گے یا نہیں تو آپ کہیں گے کہ ہاں یہ بھی ایک درجہ مالدار ہونے کا ہے اور اگر کسی کے پاس صرف پچاس ہی روپیہ ہوں تو اس کے متعلق بھی آپ کہہ دیں گے کہ ہاں یہ بھی کچھ درجہ کہا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اگر ایک پیسہ والے کے بارہ میں آپ سے یہی سوال کیا جائے کہ وہ بھی مالدار کہا جا سکتا ہے یا نہیں تو آپ پوچھنے والے پر ہنسیں گے کہ آپ بھی عجب عقلمند ہیں کہیں ایک پیسہ کے مالک کو بھی مالدار کہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی مال میں مال ہے۔ مگر حضرت میں پوچھتا ہوں کہ مال کہتے ہیں کس کو۔ مال کی تعریف آخر یہی تو ہے عَیْنٌ یُّنْتَفَعُ بِہٖ یعنی جس عین سے یا یوں کہیئے جس ذات سے کوئی نفع حاصل کیا جا سکے۔ پھر میں کہتا ہوں ایک پیسہ سے بھی تو نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک پیسہ کا تیل لے کر ڈبیہ میں ڈال کر پھر دیکھو رات بھر

گھر میں کیسا اُجالا رہتا ہے۔ تو کیوں صاحب جب اس پیسہ پر مال کی تعریف صادق آتی ہے تو اس کے مالک کو مالدار کیوں نہ کہا جائے گا۔ آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ بھائی مالدار تو اسی کو کہیں گے جس کو قابلِ اعتبار درجہ مال کا حاصل ہو۔ اگر ایک پیسہ والا بھی اپنے کو مالدار کہے یا سمجھے تو شرم کی بات ہے اس کا اپنے آپ کو مالدار کہنا لغۃً صحیح ہے مگر معتدبہ مالدار تو اسی کو کہیں گے جس کے پاس معتدبہ مقدار مال کی ہو خلاصہ یہ کہ معتدبہ مقدار کے مالک کو مالدار کہتے ہیں۔ غرض یہاں تو آپ نے یہ منطق سیکھ لی کہ مطلق کو اس کے اطلاق پر نہ رکھا بلکہ اس کو مقید کیا ایک مقدارِ خاص کے ساتھ اُس مقدار تک پہونچنے سے قبل اس کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اس کو مالدار کہیں۔ سو یہاں تو آپ نے یہ منطق یاد کر رکھی ہے اور اسی کی نظیر میں آپ ہم سے اُلجھتے ہیں۔ بس ایک کلمہ پڑھ کر دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کہتے ہیں کہ آخر مسلمان کہتے کس کو ہیں اسی کو نا جس کے پاس اسلام ہو۔ سو ہم کلمہ گو ہیں اس لئے ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہاں مسلمان وہی ہے جس کے پاس اسلام ہو لیکن کیسا اور کس درجہ کا اسلام ہو۔ آیا کوئی خاص درجہ اسلام کا مراد ہے یا کسی درجہ کا ہو۔ آپ کے نزدیک کافی ہے۔ کچھ خبر بھی ہے اس کے درجات کتنے ہیں۔ حضرات اس کے بہت سے درجات ہیں جن میں سے اس وقت صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو سب مانتے ہیں ایک ادنیٰ درجہ ایک اعلیٰ درجہ ادنیٰ درجہ اسلام کا کسے کہتے ہیں۔ اُسے کہتے ہیں کہ جس کے بدون مسلمان ہی نہ کہا جا سکے اور وہ کون سا ہے۔ وہ اس کا قائل ہونا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کوئی اس کا بھی قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے۔ یہ تو گویا ادنیٰ درجہ ہوا اسلام کا اب آگے اس کی تکمیل ہوتی ہے نماز سے روزہ سے کثرتِ ذکر سے خشیت سے معرفت سے صبر سے توکل سے اخلاص

سے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ سب مکمل ہیں اسلام کے یہ اسلام کا اعلیٰ درجہ ہوا۔ تو یہ دونوں درجے اسلام کے وہ ہیں جن کو سب مانتے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارا آپ کا اسلام کون سے درجہ کا ہے اس پر کوئی شیخی باز کہنے لگے کہ جو کامل الاسلام کہے جاتے ہیں وہی کون سے تیر چلا رہے ہیں ان میں ہم سے زیادہ کیا چیز ہے۔ یہی نماز روزہ وہ بھی کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں پھر ہم سے کس درجہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے مگر حضرات آپ ہیں کس ہوا میں ہم میں ان میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے پاس تو محض صورت ہے نماز روزہ کی معنی ہیں ہی نہیں اور اس میں میں اپنے آپ کو بھی داخل کرتا ہوں۔ قطع نظر تواضع سے۔ کیونکہ یہ موقع تواضع کا نہیں ہے اس وقت تو بیان واقع کا کیا جا رہا ہے غرض ہم لوگ ادنیٰ درجہ کے مسلمان ہیں اب میں پوچھتا ہوں کہ اس ادنیٰ درجہ کے اسلام پر آخر آپ کیوں کفایت کرتے ہیں آگے کا درجہ کیوں نہیں حاصل کرتے جیسا کہ مال کے ادنیٰ درجہ پر کوئی قناعت نہیں کرتا۔ یہاں پر آکر اپنی وہ منطق سب بھول گئے بلکہ ایک نئی منطق ایجاد کی ہے کہتے ہیں کہ صاحب حدیث شریف میں آیا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہو گیا سو اس درجہ کا اسلام ہمارے پاس ہے ہی باقی ہم سے نماز روزہ کا جھگڑا نہیں ہوتا اجی جنت میں داخل ہونا ضروری چیز ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما ہی چکے ہیں کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ میں کہتا ہوں کہ صرف دَخَلَ ہی فرمایا ہے یا یہ بھی فرما دیا ہے کہ دَخَلَ دُخُوْلًا اَوَّلِیًّا یعنی فوراً جنت میں داخل ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جنت میں جائے گا۔ لیکن کب جائے گا اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ سزا کے قبل جائے سو آپ کو کیا حق ہے اس کی تعیین کا۔ کیا کوئی دلیل آپ کے پاس ہے اس کی دلیل تو کیا ہوتی بلکہ اُلٹی اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے حدیث میں شراب

خوری پر سود لینے پر جھوٹ بولنے پر حقوق ضائع کرنے پر غیبت پر چغل خوری پر بد نظری وغیرہ پر سخت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ پھر آخر یہ حدیثیں کیا بیکار ہیں یا نعوذ باللہ سچی نہیں ہیں یہ بھی سچی ہیں اور یہ حدیث بھی سچی ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ دونوں سچی ہیں کیونکہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ ہیں لہٰذا میں دونوں کو جمع کرتا ہوں کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تعارض اور تناقض ہو نہیں سکتا تو لامحالہ وہ مضمون جنت میں داخل ہونے کا بھی ٹھیک ہے اور وہ دوزخ کی وعیدیں بھی سچی ہیں۔ یہ دونوں قسم کی حدیثیں دو طرح سچی ہو سکتی ہیں۔ یعنی عقلاً دو احتمال ہیں ایک صورت یہ کہ اوّل اپنے معاصی کی سزا پانے کے لئے دوزخ میں داخل کئے جائیں پھر ایمان کی وجہ سے وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں اور ایک صورت یہ کہ پہلے جنت میں داخل کئے جائیں پھر دوزخ میں۔ لیکن اس کا تو کوئی قائل ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو نصوص قطعیہ سے منفی ہے کہ جنت میں پہونچا کر پھر وہاں سے نکالا جائے۔ ضرور دوسری شق کو متعین کیا جائے گا اور وہی نصوص کے مطابق بھی ہے یعنی پہلے دوزخ میں سزا پا کر پھر جنت میں داخل کئے جائیں گے خواہ ایک دن کے بعد یا ہزار برس کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اور وہاں کا تو ایک دن بھی یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے تو ہزار برس تو کیا کچھ ہو گا چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن برابر ایک ہزار سال کے ہے تم لوگوں کے شمار کے موافق) یعنی ہمارے یہاں کا ایک دن تمہارے یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے اگر وہاں ایک دن کی بھی حوالات ہو گئی تو یہاں کی ہزار برس کی قید کی برابر سمجھیے لیکن ہر حال میں کبھی نہ کبھی ختم تو ضرور ہو گا مگر قبل جنت کے جو جہنم میں سزا ہوئی ہے کیا

وہ ایسی ہی سزا ہے جیسی دنیا کی جس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسی ہی ہوتی تو خیر یہ کہہ سکتے تھے کہ چلو دوزخ ہی میں چند روز رہ آئیں گے مگر اے صاحبو وہاں کی سزا کا کیا ٹھکانا ہے اللہ تعالیٰ بچاوے جن اعمال کو لذت کے لئے اختیار کیا تھا ان سے اُس قدر لذت نہیں پہونچی جس قدر ان کی سزا کے اندر کلفت ہوگی۔ میں کہتا ہوں کسی کی عمر پچاس ساٹھ برس کی ہوئی۔ پھر اُس میں بھی جو انتفاع کے قابل زمانہ ہوتا ہے وہ تو چند ہی ایام ہوتے ہیں۔ اور گناہ سے لذت اٹھانے کی تو کچھ ساعتیں ہی ہوتی ہیں اس کے بعد کچھ بھی نہیں تو اس کے لئے ہزار برس کی قید جو کہ ادنیٰ درجہ کی ہے گوارا کرنا کون عقل کی بات ہے۔ بہرحال اس حدیث مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ سے تمسک کرنا بے فکری کے لئے کافی نہیں۔ یہ تو ایک عقیدہ کی تعلیم ہے کہ مومن خلود فی النار سے محفوظ رہے گا کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ مگر یہ کہاں کہا گیا ہے کہ اس کو اس طرح گناہوں کے کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس طرح سے جان جان کر اس کو گناہوں کے کرنے میں استعمال کرنا یہ تو بڑی ہی ناشکری اور دلیری بلکہ گستاخی ہے خلاصہ یہ کہ یہاں وہ منطق کہ ادنیٰ درجہ پر قناعت نہیں کی جاتی بھول گئے اور ادنیٰ درجہ کے اسلام کو مسلمان بننے کے لئے کافی سمجھ لیا تو ایسے کو مسلمان کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک پیسہ کے مالک کو مالدار کہنے لگیں گو جیسے وہاں باعتبار اطلاق کے ایسے شخص پر مالدار ہونا صادق آتا ہے اسی طرح یہاں بھی ایسے شخص پر مسلمان ہونا صادق آتا ہے مگر جیسا کہ وہاں اس پر نظر ہے کہ جب معتدبہ مقدار مال کی نہ ہوئی تو وہ کیا مال ہوا ایسے ہی یہاں نظر چاہیئے کہ جب معتدبہ درجہ اسلام کا نہ ہوا تو وہ کیا اسلام ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار معتدبہ کو نفی ذات کی صورت میں تعبیر فرمایا چنانچہ ارشاد ہے مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ یعنے اب بہت صاف معنی ہو گئے

اس حدیث کے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نماز جان کر چھوڑ دے وہ مسلمان نہ رہا۔ اس کی اور توجیہوں میں محض تکلف ہے۔ لیکن سیدھی تاویل جو جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے موافق ہے وہ یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال اسلام کی نفی کی ہے مطلق نفی اسلام مراد نہیں۔ جمہور کی یہی توجیہ ہے۔ میں نے اس کو محاورات میں تعبیر کر دیا ہے۔ اب اس کے معنی بالکل صاف ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسا ہی کافر فرمایا ہے جیسے ہم پیسہ کے مالک کو غیر مالدار کہہ دیتے ہیں۔ گو فی نفسہ نہ وہ علی الاطلاق کافر ہے نہ یہ علی الاطلاق غیر مالدار کہہ دیتے ہیں تو جیسے یہ حکم صحیح ہے اور اس میں کسی کو شبہ نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کو نہ طالب علم کو نہ کسی فلسفی کو نہ عامی کو اسی طرح یہاں بھی نہ ہونا چاہیئے۔ تو معلوم ہوا کہ کمال اسلام وہ چیز ہے جس کی نفی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی الاسلام سے تعبیر فرمایا تو صاحبو وہ درجہ اسلام کا ہم کو کیا خوش کر سکتا ہے جس کو نفی اسلام سے تعبیر کیا جا سکے اور واقعی کیا مسلمان ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ اور کہنے کو ہیں مسلمان۔ مگر اس مسلمان نے یہ فتویٰ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سُنا کہ جو نماز کو عمداً ترک کر دے وہ کافر ہو جاتا ہے حیرت ہے کہ ایسے اسلام سے کیونکر تسلی ہو جاتی ہے مگر مال کے اس درجہ سے تسلی نہیں ہوتی۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس اتنی مقدار مال کی تھی کہ وہ مالدار مشہور تھا۔ ایک دن اس کی عدم موجودگی میں کہیں گھر کے اندر چور گھس آئے اور جو کچھ اندوختہ تھا سب لے گئے صرف دو چار پیسہ جو اتفاق سے اس کی اچکن کی جیب میں تھے وہ تو پڑے رہے باقی سارا مال و متاع جاتا رہا اب اس پر وہ کبھی یہ نہ کہے گا کہ اجی کامل مالدار اگر نہ رہا نہ سہی کیا کم ہے۔ کسی درجہ میں تو مالدار اب بھی ہوں ہی چنانچہ جیب میں چار پیسے موجود ہیں۔ وہاں کبھی جی کو تسلی نہیں ہوتی کہ چار پیسے تو موجود ہیں بلکہ اگر

کوئی سمجھائے بھی کہ کیوں غم کرتے ہو بلا سے زیادہ مال نہ رہا چار پیسے تو موجود ہی ہیں یہ بھی تو آخر ایک مقدار مال ہی کی ہے اور اس کے اعتبار سے اب بھی تم مالدار ہی ہو۔ تو کیا اس تقریر سے اس کی تسلی ہو جائے گی یا طیش میں آکر یہ کہے گا کہ آپ بھی عجب چیز ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ مال ہوگا۔ بھلا چار پیسے بھی کوئی مال میں مال ہے میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے بجز ان چار پیسوں کے۔ اور ان سے کیا خاک کام چل سکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مال تسلی بخش نہیں ہے تو وہ اسلام کیونکر تسلی بخش ہو گیا۔ آخر وجہ فرق کیا ہے۔ اسی کو مولانا غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اَرَی الْمُلُوْکَ بِاَدْنَی الدِّیْنِ قَدْ قَنَعُوْا
وَمَا اَرَاھُمْ رَضُوْا فِی الْعَیْشِ بِالدُّوْنِ

یعنی میں دیکھتا ہوں امرا اور بادشاہوں کو کہ وہ ادنیٰ درجہ کا دین لیکر قناعت کر لیتے ہیں نماز پڑھنے لگے تو اپنے نزدیک بہت بڑے عابد زاہد ہو گئے اور اگر کہیں کسی نے کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں تب تو پھر کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہو گئے۔ ایک احمق قوم کا شخص تھا اس کا بیٹا ایک عالم کے پاس کچھ عربی فارسی پڑھنے لگا۔ اس کے یہاں سات پشت سے بھی کوئی پڑھا لکھا شخص نہ گذرا تھا۔ جب اس نے ہدایت النحو شروع کی تو آپ گئے مولوی صاحب کے پاس اور کہنے لگے کہ اجی بہت نہ پڑھا دیجو۔ کہیں یہ لوٹ پوٹ پیغمبر نہ ہو جائے۔ صاحب زادہ صاحب نے ہدایت النحو کیا شروع کی اس کے نزدیک گویا پیغمبری ملنے لگی نعوذ باللہ۔ تو اوچھے لوگ کیا سمجھیں کہ علم کیسا ہوتا ہے۔ اس کے خاندان میں کوئی یہ بھی نہ جانتا تھا کہ علم کہتے کسے ہیں۔ اسی طرح اے صاحب ہم نے پانچ وقت کی نماز کیا پڑھ لی جنت کے خریدار ہی بن بیٹھے۔ بس مطمئن ہیں کہ نیلام ہمارے ہی نام ختم ہو گا،

جب کہ اتنی بڑی قیمت بھی ہم نے لگا دی ہے۔ ایک طالب علم کسی معقول خانہ کے پڑھے ہوئے تکمیل کی غرض سے دیوبند آئے۔ دیوبند میں ماشاء اللہ نمازوں کا بڑا اہتمام ہے کوئی تاکید نہیں کوئی جرمانہ نہیں مگر علم دین کی یہ برکت ہے کہ خود بخود سب طلباء پابند ہیں۔ انھوں نے معقول خانہ میں بھلا یہ رنگ کہاں دیکھا تھا۔ کہنے لگے میاں نمازوں کا کچھ ٹھکانہ بھی ہے ہر وقت نماز ہر وقت نماز اے اللہ کہاں کی نمازیں یہاں پھٹ پڑی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں پچاس نمازوں کے بجائے تخفیف ہو کر جو صرف پانچ رہ گئی ہیں تو وہ تخفیف دوسری ہی جگہوں میں ہوئی ہے۔ مدرسہ دیوبند میں وہ پچاس کی پچاس ہی قائم رکھی گئیں جہاں دو منٹ گذرے بس چلو نماز کو جہاں پانچ منٹ گذرے بس چلو نماز کو جان آفت میں آگئی پڑھتے پڑھتے۔ کوئی کہاں تک پڑھے جا دے۔ ان حضرت کو یہ پانچ نمازیں بھی پچاس نظر آتی تھیں تو ایسا شخص اگر پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگے تو نہ معلوم اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے۔ پھر ایسوں میں سے خاص کر جو دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ان کی حالت تو کچھ پوچھیے ہی نہیں یعنی ایک جماعت کی جماعت ہے ہم مسلمانوں میں جس نے دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے ان کا مذاق یہ ہے کہ دین تو ادنیٰ درجہ کا بھی کافی ہے مگر دنیا اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہیئے حالانکہ مذاق یہ چاہیئے تھا کہ دنیا لو ضرورت کے موافق اور دین لو کمال کے درجہ کا۔ اسی کو حضرت غزالیؒ نے فرمایا ہے ؎

اَرَی الْمُلُوْکَ بِاَدْنَی الدِّیْنِ قَدْ قَنَعُوْا
وَمَا اَرَاھُمْ رَضُوْا فِی الْعَیْشِ بِالدُّوْنِ
فَاسْتَغْنِ بِالدِّیْنِ عَنْ دُنْیَا الْمُلُوْکِ کَمَا
اِسْتَغْنَی الْمُلُوْکُ بِدُنْیَاھُمْ عَنِ الدِّیْنِ

یعنی جیسا ان امرا نے یہ کیا ہے کہ تھوڑے سے دین پر قانع ہو گئے ہیں حالانکہ دنیا کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہیں اسی طرح تم یوں کرو کہ دنیا کے ادنیٰ درجہ پر قناعت کرلو لیکن دین کے ادنیٰ درجہ پر قناعت ہرگز نہ کرو بلکہ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے حصول کی فکر میں لگے رہو کیونکہ دین کے درجات کی کوئی انتہا ہی نہیں اس کا اعلیٰ درجہ بھی گویا ادنیٰ ہی درجہ ہے اس کی شان ہے وراء الوراء ثم وراء الوراء مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست   ہر چہ بروے میرسی بروے مالیست

(اے بھائی اس کی درگاہ بہت ہی بڑی ہے۔ جس منزل پر تیری رسائی ہو جائے اس پر قناعت کر)

جیسے دنیا میں ترقی کرنے والے برابر کوشش کرتے رہتے ہیں تم دین میں ترقی کی برابر کوشش کرتے رہو۔ کسی وقت چین نہیں چاہیئے اور واقعی چین کیسے آسکتا ہے عاشق کو تو چین مرتے دم تک بھی نہیں اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ، ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا نہ سعدی کے کلام کی۔ جیسے جلندر کا مریض پیاسا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے)

اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

دل آرام بر دل آرام جو   لب از تشنگی خشک و بر طرف جو

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں)

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند   کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(میں نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں۔ لب دریا ہوتے ہوئے بھی پیاسے ہیں)

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(راہِ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا۔ جیسے انگور کو جتنا کاٹو گے اور بڑھے گا)

دیکھئے تو اگر کوئی ادنیٰ سی مردار عورت پر فریفتہ ہو جائے اور وہ عورت اس کو اپنے وصال سے محظوظ بھی کر دے تو کیا اس کا جی بھر جائے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ یہی کہے گا کہ ہائے عشق کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ساری عمر بھی میرے پاس رہے تب بھی جی نہ بھرے۔ جب ایک ادنیٰ سی مردار عورت کے عشق میں یہ حالت ہے کہ ساری عمر بھی وہ پاس رہے تب بھی جی نہیں بھرتا تو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن   صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

(اے بندۂ خدا تو اپنے اہل و عیال سے صبر نہیں کر سکتا۔ تو اللہ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے)

ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں   صبر چوں داری ز نعم الماہدون

(اے بندۂ خدا تجھے کمینی دنیا سے صبر کرنے کی طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کیونکر صبر کر سکتا ہے)

جب دنیائے دوں سے جی نہیں بھرتا تو خدا سے کیسے جی بھر گیا۔ ایک کلمہ پڑھ کر قناعت کرلی کہ بس بہت ہے دخل الجنۃ کا وعدہ مرتب ہو ہی جائے گا۔ اے صاحبو! دخل الجنۃ بالکل سچ ہے مگر اس کے قبل دوزخ کیسی ہے کچھ دیکھتے بھی ہو۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالدار اس کو کہتے ہیں جس کے پاس معتدبہ مال ہو اسی طرح مسلمان اس کو

کہتے ہیں جس کے پاس معتدبہ اسلام ہو اس غلطی میں عام طور پر لوگ مبتلا ہیں اس لئے اس کا بھی رفع کرنا مقصود تھا غرض یہ بھی وجہ ترجیح تھی اس آیت کے اختیار کرنے کی۔ تو غرض اس آیت کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس میں جو مضمون مذکور ہے اس میں حق جل وعلا شانہ نے اسلام کی حقیقت بتائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے تو فرماتے ہیں وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ فرماتے ہیں کون شخص ایسا ہے جو اعراض کرے ابراہیم علیہ السّلام کے طریقہ سے ابراہیم علیہ السلام کا طریق تو ایک ایسی ملّت تھا اور ایک ایسا مشرب تھا کہ کون سا مقبول بندہ ہے جو اس سے روگردانی کرے اعراض کرے اباء کرے استغنا کرے اس کو ترک کرے یا اس سے ہٹ جاوے سوا اُس کے جس نے اپنے نفس کی بیقدری کی سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی۔ سوا اس کے کوئی ایسا نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو نفس کی قدر جانے گا وہ اس کو فائدہ پہونچائے گا اور ضرر سے بچائے گا۔ کیوں نفس کی یہی قدر ہے اس کو نفع پہونچانا اور مضرت سے بچانا۔ تو جو اپنے نفس کی قدر جانے گا وہ ملّتِ ابراہیمی کو ضرور اختیار کرے گا اور کیوں اختیار کرے گا جب وہ چیز ہی اس درجہ کی ہے کیونکہ اس کی ہی برکت سے ابراہیم علیہ السلام اس درجہ کو پہونچے جس کو فرماتے ہیں وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا یعنی ہم نے انھیں مقبول بنایا تھا دنیا میں۔ اور حرف تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہیں یعنی اس ملّت کی برکت سے وہ دنیا میں بھی مقبول تھے اور آخرت میں بھی مقبول ہیں۔ تو وہ ملّت ابراہیم ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ابراہیم علیہ السلام ایسے درجہ کو پہونچے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہوگی پھر بھلا ایسی چیز سے کون اعراض کرسکتا ہے سوا جاہل کے اور سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی آگے اس ملّت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے ارشاد ہے

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ یعنی جب ان کے رب نے کہا کہ اسلام اختیار کرو۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت ابراہیمؑ تو اسلام پہلے سے بھی لائے ہوئے تھے تو پھر اس کے کیا معنے تو یہ سمجھو کہ یہ کہنا ایسا ہے جیسے میاں جی نے سبق پڑھا دیا لڑکے نے اسے یاد کر کے سنا بھی دیا۔ اب دوسرے دن میاں جی نے جب کہا کہ آؤ سبق پڑھو تو وہ کہے کہ اجی کل تو سبق پڑھ چکا ہوں اور یاد کر کے سُنا بھی چکا ہوں۔ یہ آج پھر پڑھانا کیسا تو وہ میاں جی کہتا ہے کہ ارے بھائی کل جو تم نے پڑھا ہے تو کیا ساری کتاب ختم کرلی ہے کیا اب کچھ پڑھنے کو باقی نہیں رہا۔ کیا ایک ہی سبق میں علم کی پوری تکمیل کر چکے۔ ارے ابھی اور بھی تو بہت کچھ پڑھنا ہے تو جس طرح میاں جی کہتا ہے کہ اور پڑھو اسی طرح یہ ارشاد ہے کہ اسلم مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں لڑکے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کل تو پڑھ چکا تھا۔ اور یہاں کوئی نبی ایسا نہیں جو اسلم کے جواب میں یہ کہے کہ اسلام لا چکا بلکہ جواب میں وہ کہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے کہا یعنی یہ کہا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہ میں نے اسلام اختیار کیا یہ ترجمہ کا حاصل ہوا اس میں تعیین ہو گئی اُس ملّت کی کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ جو آیت میں نے بیان کے لئے اختیار کی ہے اس میں اسلام ہی کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اور معلوم ہوا کہ یہی وہ ملّتِ ابراہیمی ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے اب اس کے ساتھ اگر سیاق وسباق کو بھی ملا لیجئے تو اسلام کی فضیلت اور عظمت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے یعنی اس کے قبل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے ساتھ جمع ہو کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اس کا واقعہ مذکور ہے اور اس دوران میں جو دعائیں دونوں نے مل کر مانگی تھیں وہ نقل کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (اور جب کہ اٹھا رہے تھے حضرت ابراہیم (علیہ السّلام دیواریں

خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل (علیہ السلام) بھی کہ لے ہمارے پروردگار یہ خدمت ہم سے قبول فرمایئے بلاشبہ آپ خوب سُننے اور جاننے والے ہیں) پھر ان کی دوسری دُعا نقل فرمائی ہے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ تو یہاں اپنے واسطے بھی دُعا مانگی ہے کہ لے اللہ ہم کو سچا مسلمان بنا دے۔ دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے اِسلام کہ انبیاء علیہم السّلام بھی باوجود اتنے بڑے درجہ پر ہونے کے یہ دعا مانگتے ہیں کہ لے اللہ ہمیں کامل اسلام عطا فرما۔ پھر کتنی بڑی سخاوت اور خیر خواہی ہے کہ اپنے ساتھ نالائقوں کو بھی یاد فرمایا وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اور لے اللہ ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان جماعت بنائیو خواہ وہ اولاد جسمانی ہو یا روحانی اس واسطے کہ ایک جگہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ اس کے مخاطب ہیں اُمّتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام) ساری اُمّت کے حسی باپ نہیں ہو سکتے۔ تو لامحالہ یہاں روحانی باپ ہونا مراد ہے اور کہا جائے کہ نا صرف مخاطب ہیں جن کے آپ جسمانی باپ بھی ہیں تو اس آیت کا سباق وسیاق اس کا مساعد نہیں چنانچہ اوپر یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا میں عام اہل ایمان کو خطاب ہے کہ خاص عرب کو پھر آگے سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ اور تَكُونُوا شُهَدَاءَ واقع ہے جو کہ صفت مشترکہ ہے تمام اُمّت کی تو معلوم ہوا أَبِيكُمْ عام ہے جسمانی باپ ہونے کو بھی اور روحانی باپ ہونے کو بھی۔ غرض وہ یعنی اہلِ عرب جسمانی اولاد ہیں اور غیر اہلِ عرب روحانی اولاد ہیں ان سب کو بھی اپنے ساتھ دُعا میں یاد فرمایا البتہ اس اولاد میں سے ان کو مستثنیٰ کر دیا جو اسلام کے ساتھ موصوف نہ ہوں چنانچہ یوں نہیں فرمایا وَذُرِّيَّتِنَا بلکہ مِنْ بڑھا دیا کیونکہ اس کے قبل جو اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ (میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا) کی بشارت سُن کر دُعا کی تھی وَمِنْ ذُرِّيَّتِي اور اس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ اس سے ان کو معلوم ہو گیا تھا

کہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جو طریقِ حق پر نہ ہوں گے اس لئے اس دعا میں ان کو مستثنیٰ کر دیا اس دعا میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ نے لقب اس اُمّت کا مسلم رکھا جس کا ذکر ایک تفسیر کی بناء پر دوسری آیت میں بھی ہے هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ کیونکہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف ضمیر راجع ہو۔ بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے بھی اسلام کو ثابت کیا اور اُمّتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے بھی اسلام کی درخواست کی اس سے اسلام کا جو کچھ شرف ثابت ہے ظاہر ہے۔ یہ تو سباق میں نظر تھی آگے سیاق یعنی مابعد میں دیکھئے تو ایک صفحہ کے اندر ہی اندر جا بجا اسلام کا ذکر فرمایا گیا ہے سب سباق وسیاق میں جو میں نے غور کیا تو سات جگہ اسلام کا ذکر ہے ایک وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ میں دوسرا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ میں تیسرے قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ میں چوتھے أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ میں پانچویں فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ میں چھٹے وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ میں ساتویں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ میں اور محاورات عرب میں سات کا عدد یہ کثرت کا مرتبہ ہے اور جب اور مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو ستر کا عدد استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ سات اور ستر کا استعمال کثرت کے لئے احادیث کثیرہ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا کیا درجہ ہے کہ ایک ہی مقام پر بار بار اس کا کس طرح ذکر کیا جاتا ہے نیز اس مقام کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کا مذہب اسلام ہی رہا ہے۔ تو اسلام اتنی قدر کی چیز ہے۔

صاحبو! اس لئے میں نے یہ مضمون بیان کے لئے اختیار کیا ہے تو یہ اسلام کی اہمیت و عظمت کا ذکر ہوا اب اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیئے جس کو میں مختصراً عرض کرتا ہوں اسلام اصل میں ایک لغتِ عربی ہے پھر اور قرآن حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں جو اس لفظ کا استعمال کیا گیا تو اس کے ساتھ لغوی معنوی پر

ایک قید بڑھ گئی ہے اس لحاظ سے دو قسم کا اسلام ہوا ایک تو اسلام لغوی اور ایک اسلام شرعی۔ اسلام لغوی کے معنے ہیں سپرد ن سونپ دینا۔ اسی کو تعبیر کر دیتے ہیں گردن نہادن بہ طاعت سے۔ غرض جو تسلیم کے معنی ہیں وہی اسلام کے معنے ہیں۔ مادہ دونوں کا سین لام میم ہے اور ان حروف میں تسلیم کے معنے مودع ہیں چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے بلیٰ مَنْ اَسْلَمَ ای مَنْ فَوَّضَ ذَاتِہٖ اللّٰہ یعنی جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے۔ غرض اسلام کے معنے ہیں سپرد کر دینا۔ شریعت نے اس میں ایک اور قید بڑھائی یعنی ایک قید تو اَسْلَمَ کے معمول میں بڑھائی اور ایک قید اس کے متعلق میں۔ لغوی اسلام میں کوئی قید نہیں۔ اس کے معنی ہیں مطلق سپرد کرنا۔ جس کو چاہے سپرد کرنا اور جس کے چاہے سپرد کرنا۔ اب اسلام شرعی کی قیدیں سنیئے۔ ایک قید تو یہ ہے کہ اسلم کا معمول کون ہے خود اپنی ذات اور اس کا متعلق کون ہے۔ اللہ حاصل کیا ہوا اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا۔ یہ ہے حقیقتِ اسلام شرعی کی۔ اب گویا طالب علمانہ عنوانات سے تو فراغت کر چکا۔ میں نے چاہا تھا کہ ایسے علمی عنوانات بیان میں نہ آنے پائیں کیونکہ یہاں کے اکثر حضرات بوجہ اختلاف زبان ایسے مضامین کو کم سمجھتے ہیں مگر کیا کیا جائے بغیر ایسے طالب علمانہ عنوانات کے مضمون منضبط نہیں ہوتا۔ اور مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔ اب میں انشاء اللہ بالکل عام فہم تقریر کروں گا مگر غالب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں پھر بھی ایسے الفاظ آ ہی جاویں گے خیر ایک آدھ جگہ اب بھی سہی۔ اب بعد تفسیر اسلام کے یہ دعوے قرآن مجید سے ثابت ہو گیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب اسلام یعنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنا رہا ہے اور آپ کو بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ آپ کو تو اور اُمم پر ایک خاص شرف منجانب اللہ عطا ہوا ہے وہ یہ کہ گو تمام اطاعت کرنے والوں کی صفت یہی تھی یعنی اسلام مگر لقب خاص آپ کو ہی دیا گیا۔ یعنی اطاعت کرنے والے اور اسلام لانے والے اور امتوں میں بھی تھے مگر لقب اُمت مسلمہ کسی کا بھی نہیں تھا۔ جتنے مقبولانِ حق

گذرے ہیں صفت سب کی اسلام تھی مگر لقب خدا تعالےٰ نے اُمّت مسلمہ اور کسی کو نہیں دیا۔ مثلاً ایک زمانہ میں دینِ حق کا لقب عیسائیت تھا ایک زمانہ میں یہودیت تھا وعلیٰ ہٰذا القیاس اور گوہر اُمّت کا ایک خاص طریق رہا ہے یعنی باعتبار فروع کے مگر یہ صفت سب میں مشترک تھی کہ سب خدا تعالےٰ کے مطیع بندے تھے حاصل یہ کہ مشترک صفت سب کی اسلام تھی۔ لیکن لقب اُمّت مسلمہ کا خاص آپ کو ہی عطا کیا گیا۔ یہ کتنا بڑا شرف ہے پھر شرف پر شرف یہ کہ لقب بھی ملا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطے سے۔ یہاں گورنمنٹ اگر کسی معزز حاکم کے ذریعہ سے آپ کو کوئی لقب دے تو اس میں دو شرف سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ گورنمنٹ کا دیا ہوا لقب ہے پھر ایک معزز حاکم کے ذریعہ سے اس لقب کو ہم تک پہونچایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو لقب عطا فرمایا ہے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے معزز پیغمبر کی زبان سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان وہ ہے کہ اگر وہ اپنی رائے سے بھی ہمارے لئے یہ رائے فرما دیتے تب بھی بہت بڑا شرف تھا نہ کہ جب رائے سے بھی نہ ہو بلکہ آپ کی یہ شان ہو ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ کا فرمان گویا خدا کا فرمان ہے۔ اگرچہ ایک اللہ کے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے)۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی خصوص ہماری رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع واعلیٰ ہے حضرات اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں کہ جو کچھ بھی انھوں نے کہا اپنے منہ سے نہیں کہا بلکہ خود حق تعالےٰ نے ان کی زبان کے واسطے سے کلام کیا۔ ایک قصہ میں نے اپنے اُستاد علیہ الرحمۃ سے سُنا ہے کہ ایک بزرگ تھے اُن کے پاس ایک مرد اور ایک عورت اپنے بچّہ کو لائے جو مادرزاد اندھا تھا یعنی وہ ماں

کے پیٹ ہی سے اندھا پیدا ہوا تھا اور دونوں رونے لگے کہ حضرت اوّل تو ہمارے اولاد ہی نہ ہوتی تھی۔ بہت دعائیں کیں منتیں مانیں تب تو کہیں یہ بچہ عنایت ہوا۔ مگر افسوس ہم لوگ پھر بھی محظوظ و مسرور نہ ہو سکے کیونکہ یہ اندھا پیدا ہوا۔ اب اس کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت جی کڑھتا ہے ہم نے سُنا ہے کہ آپ بہت بڑے مقبول الدعوات بزرگ ہیں للہ ہمارے حالِ زار پر رحم فرمایئے اور دعا کر دیجئے کہ اس کی آنکھیں اچھی ہو جائیں اُس زمانہ کے لوگ آج کل کی طرح بدعقیدہ نہ تھے یہ نہیں کہا کہ آپ اچھا کر دیں بلکہ یہ کہا کہ آپ دُعا کر دیں مگر یہ درخواست سن کر بھی کمال انکسار کے غلبہ سے آپ کو جوش آگیا اور فرمانے لگے بگڑ کر کہ کیا میں عیسیٰ ہوں جن کی دعا سے اندھے مادر زاد اچھے ہو جاتے تھے۔ وہ بے چارے مایوس اور شکستہ دل ہو کر چلے گئے۔ بس ان کا جانا تھا کہ ان بزرگ کی زبان پر بے اختیار یہ جاری ہو گیا ماکنیم ماکنیم ہم اچھا کریں گے ہم اچھا کریں گے لاؤ اس کو بُلا کر۔ خدام کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا تو عیسیٰ بھی نہ بنتے تھے اب خدا ہی بننے لگے مگر اس وقت کچھ کہنا بے ادبی تھا۔ دوڑ کر اس کو بلا لائے۔ آپ نے اپنا ہاتھ اس بچہ کی آنکھوں پر پھیر دیا۔ بس ہاتھ پھیرتے ہی آنکھیں اچھی خاصی ہو گئیں اور وہ لوگ دعائیں دیتے ہوئے خوش بخوش اپنے بچہ کو گھر لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد موقع پا کر بعض خاص خادموں نے عرض کیا کہ حضرت یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یا تو دعا کرنا بھی گوارا نہ تھا یا ایک ساتھ ایسے دعوے کے ساتھ فرمانے لگے ماکنیم۔ ماکنیم۔ آپ نے فرمایا بھائی یہ میں نہیں کہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ جس وقت وہ لوگ چلے گئے تو مجھ پر عتاب ہوا کہ تم نے جو عیسیٰ کا نام لیا تو کیا وہ اچھا کرتے تھے کیا وہ تھے قادرِ مطلق اور فاعل حقیقی یا ہم تھے۔ ہم تو اب بھی قادرِ مطلق ہیں۔ پھر کیوں نہیں ہم سے عرض کیا۔ اگر اچھا کرتے تو ہم کرتے تم کون تھے اس کو مایوس کرنے والے اور اگر اب بھی اچھا کریں گے تو ہم کریں گے غرض ادھر تو وہ مایوس ہو کر چلے اُدھر مجھ پر یہ عتاب ہوا اور بے اختیار میرے منہ سے

وہی الفاظ خدا تعالےٰ کے نکلنے لگے ماکنیم ماکنیم۔ میں تو بہ تو بہ یہ الفاظ کیسے کہہ سکتا تھا میری بھلا کیا مجال ہے وہ تو حق تعالیٰ فرما رہے تھے میں تھوڑا ہی کہہ رہا تھا۔ تو اولیاء اللہ کی بعض بعض کی یہ حالت ہوئی ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم

(پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بٹھا دیا ہے۔ مجھے جو حکم اُستادِ ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)۔

اولیاء کی جب یہ شان ہے تو انبیاء علیہم السّلام کی شان کا تو کہنا کیا۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زبانِ مبارک سے مسلم کا لفظ نکلنا بہت بڑا شرف تھا نہ کہ خود حق تعالےٰ نے ان کے منہ سے یہ لفظ کہلوایا اور ہم نالائقوں کو یہ لقب دلوایا تو اس سے بڑھ کر اور کیا شرف ہو سکتا ہے تو دیکھا آپ نے یہ کتنا شریف لقب ہے مگر اب بس کسر اتنی ہے کہ ہم محض لفظوں پر قانع ہو گئے بقول مولانا کے ؎

میم و واؤ و میم دونوں تشریف نیست — لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

(لفظ مومن میں کوئی بزرگی نہیں ہے یہ میم، واؤ۔ نون صرف پہچان کے لئے ہیں)۔

یہ جو حرف ہیں مومن کے میم واؤ میم نون جس سے لفظ مومن بنا ہے یہ تو محض ایک پتہ کا لفظ ہے باقی میم واؤ میم نون میں کیا رکھا ہے ان سے کہیں کوئی مومن ہوتا ہے۔ ایمان تو قلب سے متعلق ہے مومن تو وہی ہے جس کے دل کے اندر ایمان رچا ہوا ہو سو واقعی بالکل ٹھیک ہے۔ لے صاحبو! محض لڈو کے لفظ کہنے سے کہیں منہ میٹھا ہو سکتا ہے۔ محض روپیہ کے لفظ سے کہیں تم جہاز کے مالک بن سکتے ہو۔ ہماری تو وہ مثال ہو رہی ہے لفظ پرستی کی جیسے کوئی مہاجن تھا۔ اس کے کوئی منیم جی تھے یا منیب جی تھے ہمیں تحقیق نہیں کہ یہ کیا لفظ ہے وہ بے چارے تھے مفلس۔ ایک دن بیٹھے

کارخانہ کا حساب وکتاب کر رہے تھے۔ ایک سائل آیا مگر وہ مہذب تھا چپکا کھڑا رہا کہ اس وقت مشغول ہیں لالہ جی۔ فارغ ہوں تو مانگوں۔ دیر تک کھڑا انتظار رہا کہ دو اور دو چار۔ چار اور چھ دس۔ دس کا صفر حاصل ایک۔ دس اور بارہ، بارہ کے دو۔ حاصل ایک۔ غرض کہیں حاصل ہوا ایک کہیں ہاتھ لگے دو کہیں حاصل ہوئے چار کہیں ہاتھ لگے چھ۔ وہ برابر کھڑا گنتا رہا۔ دس ہوئے پچاس ہوئے سو ہوئے لے اللہ کتنے حاصل ہوں گے مگر وہ سائل دل میں بڑا خوش کہ یہ تو اقراری مجرم ہے اس سے خوب وصول کروں گا۔ اس کے پاس انکار کا کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جب لالہ جی حساب سے فارغ ہوئے تو سائل نے کہا کہ اجی مجھے بھی کچھ مل جائے لالہ جی بولے کہ بھائی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں اس نے کہا اجی کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ میرے سامنے ہی تو سیکڑوں ہزاروں حاصل کر چکے ہو۔ کبھی حاصل ہوئے چار کبھی ہاتھ لگے چھ۔ گھنٹہ بھر سے تو میں یہی قصہ دیکھ رہا ہوں۔ اور میں سب جوڑتا گیا ہوں کئی ہزار تک تو فوبت پہونچ چکی ہے اور پھر کہتے ہو کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اس نے کہا بھائی مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے لفظوں ہی میں حاصل ہوا ہے واقع میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو حضرت نرے حساب سے تو کچھ کام چلتا نہیں، ایک اور بنئے صاحب تھے وہ محاسب بڑے تھے اور اپنی حساب دانی پر بڑا ناز تھا جیسے ہمیں الفاظ پر ناز ہے وہ اپنے کنبہ کو بیل گاڑی میں سوار کرا کے کہیں لے چلے۔ راستہ میں ندی آگئی۔ آپ نے بہلبان سے کہا کہ ٹھہر جا۔ میں پہلے حساب لگاؤں گا گاڑی ڈوب نہ جائے پنسل کاغذ اور ایک بانس لے کر آپ ندی میں گھسے اور جگہ جگہ بانس سے ناپنا شروع کیا کنارہ کے قریب ناپا تو ٹخنوں تک پانی تھا۔ آگے چلے تو گھٹنوں تک تھا اور آگے چلے تو کمر تک تھا اور آگے چلے تو ڈبان تھا۔ آپ نے سب کو جوڑ کر اوسط نکالا تو کمر تک نکلا۔ گاڑی بان سے کہنے لگے بس حساب ٹھیک ہے۔ چل ڈال دے گاڑی کو پانی میں۔ ڈوبے گی نہیں۔ یہ تو وہی

ہوئی چڑھ جا بیٹے سولی پر اللہ بھلی کرے گا۔ نوکر نے کہا بھی کہ ایک جگہ پانی ڈوبان بھی تو ہے۔ اُس نے ڈانٹ دیا کہ تو کیا جانے اوسط کا اعتبار ہوتا ہے کیا ہمارا حساب غلط ہو سکتا ہے۔ کچھ ڈر نہیں ڈال دے گاڑی کو۔ وہ بے چارہ آخر نوکر تھا تابعدار تھا۔ اس نے گاڑی کو پانی میں ڈال دیا مگر وہ پانی تو تابع نہیں ہو سکتا تھا ان صاحب کے اوسط کا۔ غرض تھوڑی دور چل کر حضرت لگے ڈوبنے تو اُس وقت بھی بجائے اس کے کہ کوئی تدبیر کرتا نکلنے کی احمق نے پھر بہی کھاتہ لے کر اپنا حساب جانچنا شروع کیا اور جب اوسط کو صحیح پایا تو آپ فرماتے ہیں کہ ارے لیکھا جوکھا تو پھر کنبہ ڈوبا کیوں حساب تو بالکل صحیح تھا پھر کنبہ کیوں ڈوبا غرض ایسے امور میں ہم اوروں پر ہنستے ہیں یہاں تک کہ انھیں خبطی اور بے وقوف قرار دیتے ہیں لیکن حضرت ہماری شان بھی اس بنئے [redacted] سے کہ بس الفاظ پر ناز ہے جیسے اسے اپنے حساب پر ناز تھا اپنے نزدیک شیخ چلی کا گھر بنا لیا اور خوش ہوئے۔ یہ شیخ چلی ایک خبطی سا شخص تھا یا کوئی مسخرا تھا کسی شخص کو ایک گھڑا تیل کا اپنے گھر لے جانا تھا۔ شیخ چلی کہیں نظر پڑ گئے کہا چل ہمارا گھڑا تو ذرا گھر تک پہنچا دے دو پیسے دیں گے۔ شیخ جی نے منظور کر لیا اور سر پر گھڑا رکھ کر چلے۔ اب آپ نے اپنے دل میں منصوبہ گانٹھا کہ آج ہمیں دو پیسے ملیں گے اُن سے کوئی تجارت کرنی چاہیئے۔ سوچا کہ کون سی صورت آخر کروں آخر یہ طے کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خرید لوں گا پھر کسی مرغی والے کی خوشامد کر کے مرغی کے نیچے بٹھلا دوں گا ان میں سے دو بچے نکلیں گے۔ ایک مرغا ایک مرغی انڈوں میں تھی نا ان کے باوا کی عملداری کہ ان کی مرضی کے موافق ہی بچے نکلیں گے۔ ایک نر اور ایک مادہ۔ لیکن فرض کرنا کیا مشکل ہے غرض گھر ہی کی مرغی ہوگی اور گھر ہی کا مرغا بہت سے انڈے ہوں گے اور ان کے خوب بچے ہوں گے جب بہت سے بچے ہو جائیں گے تو انہیں بیچ کر بکریاں خرید لیں گے پھر اسی طرح جب بکریاں بہت سی

ہوجائیں گی تو انہیں بیچ کر گائے خریدلیں گے پھر بھینس پھر بھینسوں کو بیچ کر گھوڑوں کی تجارت کریں گے۔ جب ہزاروں روپیہ جمع ہوجائیں گے تو ایک بڑا محل تیار کرائیں گے جب کاروبار بڑھے گا اور تجارت کے کام میں خوب ترقی ہوگی تو وزیر زادی سے نکاح کریں گے۔ یہاں تک پہونچے ہیں۔ حضرت پھر بچہ بھی ہوجائے گا جب وہ بڑا ہوگا تو اندر سے ہمیں بلانے آئے گا کہ اباجان چلو اماں جان نے بلایا ہے۔ ہم اسے ڈانٹ دیں گے کہ ہشت ہم نہیں چلتے۔ ہمیں فرصت نہیں ہے۔ اس ہشت کہنے میں آپ نے جو سر ہلایا بے ہوشی میں گھڑا نیچے گر پڑا۔ اور تمام تیل زمین پر پھیل گیا۔ مالک خفا ہونے لگا کہ ارے کمبخت یہ تو نے کیا حرکت کی تو آپ فرماتے ہیں۔ میاں جاؤ بیٹھو۔ تم اپنے ذرا سے تیل کو لئے پھرتے ہو۔ میرے نقصان کو نہیں دیکھتے۔ میرا تو سارا بنا بنایا گھر ہی بگڑ گیا سارا کنبہ اور تجارت ہی غارت گئی۔ بیوی بچے سب ختم ہوگئے۔ تو حضرت یہاں بنا لیجئے آپ شیخ چلی کا سا محل۔ قیامت میں معلوم ہوگا کہ نہ کوئی ہاتھی ہے نہ گھوڑا نہ کوئی ساز ہے نہ سامان۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ یہاں تو یہ دعویٰ نہیں کہ نحن کذا نحن کذا۔ ہم ایسے ہم ویسے۔ وہاں حقیقت معلوم ہوگی کہ ہم کیا ہیں کچھ بھی نہیں بس کیا ہے تھوڑا سا علم پڑھ لیا مولانا صاحب ہوگئے۔ دو چار ضربیں الا اللہ الا اللہ کی لگا لیں اور کچھ سُرسُری بدن میں ہونے لگی تو بس شاہ صاحب بن بیٹھے گویا سارے کمالات اپنے نزدیک یہیں پورے کر لئے مگر واقعی حالت ہماری یہ ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی دانش مند　　　　این جملہ شدی ولے مسلماں نشدی

(زاہد اور شیخ بننا تو آسان ہے لیکن مسلمان بننا مشکل ہے)

حضرت بالکل سچ ہے۔ مولوی صاحب شاہ صاحب بن لینا آسان سوداگر ملک التجار سیٹھ صاحب بن لینا آسان لیکن اگر مشکل ہے تو مُسلمان بننا۔ یعنی ہم لوگوں کی سُستی اور کاہلی کی بدولت مشکل ہے ورنہ واقع میں تو الدین یُسرٌ۔ دین میں سرتاسر سہولت

ہی سہولت ہے چنانچہ ارشاد ہے ما علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین دیکھئے یہاں بھی ذکر ملتِ ابراہیم یعنی اسلام ہی کا ہے جس کی تمہید یہ ہے کہ ماجعل علیکم فی الدّین من حرج اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو دین ہے۔ کیونکہ دین سے مراد بقرینہ مابعد وہی ہے۔ اس میں تمہارے واسطے ادنیٰ درجہ کا بھی حرج یعنی تنگی نہیں ہے حرج نکرہ ہے اور تحت میں ہے نفی کے اور نکرہ جو تحت میں نفی کے ہوتا ہے عموم کے لئے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ذرا بھی تنگی نہیں حضرت اتنا بڑا دعویٰ نہیں ہو سکتا تھا اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تنگی کا کیونکہ ہر زمانہ میں اسلام کے دشمن کثرت کے ساتھ رہے ہیں پھر کفارِ عرب کا تو مقابلہ تھا خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ لوگ رات دن اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد بھی ہے یبغونھا عوجاً دین میں ہمیشہ کجی کا کمی کا اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ علی الاعلان دعویٰ کیا گیا ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں اگر کوئی شبہ ہو تو پیش کرو۔ حضرت ایسے زمانہ میں جب کہ عرب بلکہ تمام عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا اگر اس دعوے میں ذرا بھی شائبہ شبہ کا ہوتا تو حضرت وہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مارے اعتراضوں کے تلخ کر دیتے۔ گنواتے کہ فلانے حکم میں یہ تنگی ہے فلانے حکم میں یہ ثقل ہے فلانے حکم میں یہ گرانی ہے۔ تو جب کہ لاکھوں مخالف تھے بلکہ سارا عالم مخالف تھا ایسے وقت میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ وہاں اس کے رد میں کوئی انگشت نمائی بھی نہ کر سکا اور آج یہ نئے عقلاء اعتراض کرنے بیٹھے ہیں کہ دین میں یہ سختی ہے دین میں یہ تکلیف ہے دین میں یہ دشواری ہے۔ اگر واقعی تکلیف یا تنگی ہے کسی قسم کی تو فرمائیے اس زمانہ کے لوگوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں پیش کیا اور اگر کہو کہ پیش کیا ہوگا تو میں کہتا ہوں

کہ کہیں نہ کہیں تو منقول ہونا چاہیئے کیونکہ اس زمانہ سے اب تک مخالفت کی میراث برابر چلی آرہی ہے تو اگر کوئی مخالف ایسی بات کہتا جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب نہ بن پڑا ہوتا تو اُن کے ورثاء اور نائب اس کو ضرور نقل کرتے چلے آتے اور آج تاریخ میں وہ بات ضرور منضبط ہوتی بات یہ ہے کہ کسی کا منہ نہ تھا کہ سچی بات کو رد کرے گو ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ ہم رد کر سکتے ہیں چنانچہ کبھی کبھی کھسیان پن اوتارنے کو یہ بھی کہہ ڈالتے کہ نَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو اس کا معارضہ کر سکتے ہیں مگر ہم چاہتے ہی نہیں۔ ارے بھائی کیوں نہیں چاہتے۔ اور کب چاہو گے اس سے زیادہ اور کون وقت آئے گا۔ اس وقت سے زیادہ کیا ذلیل ہو گے کہ جزیہ تم پر مقرر کیا گیا۔ قتل تم کئے گئے۔ قید تم ہوئے اور لَوْ نشاء ہی کی نوبت اور ساعت نہیں آتی۔ بس معلوم ہوا کہ واقع میں عاجز تھے کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامانِ غلام دعوے کے ساتھ کہتے ہیں چنانچہ اس وقت میں ہی صلائے عام اور ندائے عام دیتا ہوں ساری دنیا کو کہ ایک مقام پر بھی دین میں تنگی تو ثابت کر دیں ایک شخص بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ اور صاحب یہ نہ سمجھیئے کہ یہ یوں ہی اڑا رہا ہے دین میں تنگی تو ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں تو ہاں ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں کہ صاحب یہ غضب کا دعویٰ ہے کہ دین میں کوئی تنگی ہے نہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً تجارت ہی میں لاکھوں تنگیاں ہیں جن سے لین دین ہے ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم سود نہیں لیتے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ ہم مال نہیں دیتے۔ اب مرو بھوکے تم تو کہتے ہو کہ دین میں تنگی نہیں ہے اور اپنی آنکھوں سے تنگی دیکھ رہے ہیں تو ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں مگر واقعہ یہی ہے کہ دین میں ذرا تنگی نہیں ہے چنانچہ اس مضمون پر میرا بیان مستقل بیان ہو چکا ہے نفی الحرج اس کا نام ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ لکھوا لکھوا کر بغل میں

رکھ لیتے ہیں۔ صاف کر کے شائع نہیں کرتے ورنہ وہ بیان اس وقت پیش کرنے کے قابل تھا اس میں میں نے یہی ثابت کیا ہے کہ دین میں مطلق تنگی نہیں جس وقت میں نے اس بیان کے شروع میں دعویٰ کیا تھا بڑے بڑے عقلاء موجود تھے اور سب حیران تھے کہ اتنا بڑا دعویٰ کیونکر نبھے گا۔ اس کا تو خلاف واقع ہونا بالکل ظاہر ہے مگر جب بیان ختم ہو چکا تو سب نے تسلیم کر لیا کہ صاحب واقعی ثابت کر دیا۔ خیر وہ سارا وعظ تو کہاں نقل کر سکتا ہوں۔ اس وقت ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں انشاء اللہ وہی کافی ہو جائے گی سارے وسوسوں کے لئے یہ جو آیت ہے مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ سو یہ دیکھئے کہ حق جل شانہ نے تنگی کی نفی کس سے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ دین سے کی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ تنگی جو پیش آتی ہے اس کا محل آیا دین کا کوئی جزو ہے یا کچھ اور ہے اسی کی نظیر ایک اور آیت یاد آئی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ قرآن اسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہاں بھی بڑا شبہ واقع ہوتا ہے کہ صاحب کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے حالانکہ اس میں ہزاروں کو شک ہے۔ اس کا ایک بہت اچھا جواب ہے وہ یہ کہ لاریب کا تعلق اگرچہ تو قرآن کے ساتھ ہے نہ کہ لوگوں کے ساتھ یعنی دراصل خود قرآن میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے اور اگر کوئی خواہ مخواہ شک کرے تو یہ شک اس میں شک کرنے والے کے اندر ہوا کہ قرآن کے اندر کہ وہ بالکل پاک ہے ہر قسم کے شک وشبہ سے اگر کوئی کہے کہ یہ تو محض شاعری ہے یوں ہر صاحب باطل اہلِ حق کو کہہ سکتا ہے کہ تم کو جو میرے طریق میں جو شک ہے اس کا محل وہ طریق نہیں بلکہ تمہارا قلب ہے جواب یہ ہے کہ اہلِ باطل ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب دلیل سے اُس کا طریق باطل ہے تو محل شک وہ طریق ہی ہے بخلاف اہل حق کے کہ واقع میں جب وہ امر حق ہے تو منشا شک کا وہ امر حق نہ ہوگا معترض کا صرف ذہن ہوگا اور میں اس

کی ایک نظیر رکھتا ہوں۔ ایک شخص نہایت سفید کپڑے استری کئے ہوئے اور کلف دار پہنے ہوئے ہے اور ایک شخص ہے کہ زرد شیشوں کی عینک لگائے ہوئے ہے یا یرقان صفراوی کا بیمار ہے جسے دنیا کی ہر چیز میں زردی نظر آتی ہے یا بقول مولانا ؎

چوں برگردی دبرگردد سرت

کوئی کہنے لگے کہ زمین کو حرکت ہو رہی ہے۔ میرا سارا گھر گھوم رہا ہے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ گھر تو کیا تیرا سر گھوم رہا ہے۔ حالانکہ اس کا مشاہدہ ہے وہ کہے گا کہ کیا غضب کی بات ہے کہ تم میرے مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہو مگر ہم کہیں گے کہ ہم تیرے مشاہدہ کو غلط نہیں کہتے تجھے تو واقعی گھر گھومتا ہوا معلوم ہو رہا ہوگا مگر فی الواقع اس گھومنے کا گھر کے ساتھ تعلق غلط ہے۔ تیرے سر کے ساتھ تھا تو نے گھر کے ساتھ سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح کوئی مبصر سفید کپڑے کو کہے ذٰلِكَ الثَّوْبُ لَا صُفْرَةَ فِيْهِ اس کپڑے میں بالکل زردی نہیں ہے اور اس کو سن کر وہ شخص جو یرقان کا مریض ہے یا زرد عینک لگائے ہوئے ہے یہ کہنے لگے کہ میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں واللہ اس میں زردی ہے تو محقق مبصر کی جانب سے کیا جواب ملے گا۔ وہ جواب یہ دے گا کہ بھائی تو دیکھ تو رہا ہے صحیح مگر سمجھ رہا ہے غلط۔ یہ صفرت جو تجھے نظر آرہی ہے تیری آنکھ میں ہے۔ تیری عینک میں ہے کپڑے میں نہیں ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ دین میں تنگی نہیں ہے یہ نہیں کہا کہ آپ کے جو گاہک صاحب یا منیجر صاحب یا مال بھیجنے والے صاحب ولایت میں ہیں ان کے معاملے میں تنگی نہیں ہے یہ فرمایا ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کا چاہے امتحان کر لو ساری دنیا اگر یہ دین اختیار کر لے پھر جو کہیں بھی گاڑی اٹکے اور قانون میں تنگی ہونے کا یہی امتحان ہے کہ اگر ساری دنیا وہ قانون سہل اختیار کر لے تو کہیں گاڑی اٹکے اور اگر پھر بھی کہیں گاڑی اٹکنے لگے تو یہ البتہ علامت ہے قانون کی تنگی کی اور اگر اس کو سب نے اختیار نہیں کیا اور اس وجہ سے تنگی پیش آنے لگی تو یہ علامت اس

کی نہیں کہ قانون میں تنگی ہے بلکہ عمل نہ کرنے والوں میں تنگی کہی جائے گی۔ اسی طرح دین کو اگر سب اختیار کر لیں تو ہم ضمانت کرتے ہیں کہ کہیں بھی تنگی واقع نہ ہوگی مگر چونکہ بعض نے تو اسے اختیار کیا ہے اور بعض نے نہیں کیا اور معاملہ ان کا ان ہی سے پڑتا ہے اس لئے اختیار کرنے والوں کو لامحالہ تنگی پیش آئے گی بلکہ محل تنگی کا وہ اختیار نہ کرنے والے ہیں نہ کہ دین۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی طبیب حاذق کسی دیہاتی کو نسخہ لکھ کر دے لیکن اس دیہاتی کا گاؤں ایسا کہ وہ مقام ہے جہاں نہ مرغ ملتی ہے نہ انڈا ملتا ہے نہ بکری کا گوشت نہ کدو کی ترکاری نہ ماش کی دال نہ چنے کی دال اور ملتا کیا ہے وہاں کریلا۔ بینگن اور حضرت مسور کی دال بجنس کا گوشت غرض جتنی مضر چیزیں ہیں وہ تو وہاں ملتی ہیں ان کے سوا اور کچھ وہاں ملتا ہی نہیں۔ ایسے دیہاتی نے حکیم صاحب سے نسخہ لکھایا پھر پوچھا کہ کھانا کیا کھاؤں حکیم صاحب نے کہا بکری کا گوشت کھاؤ بولا جی وہ تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتا۔ کہا اچھا مونگ کی دال توری ڈال کر کھاؤ۔ بولا یہ چیزیں بھی نہیں ہوتیں۔ بھائی لوکی کھاؤ۔ اجی وہ بھی نہیں ہوتی چنے کی دال ہی سہی۔ صاحب یہ بھی نہیں ملتی۔ غرض جو جو چیز حکیم صاحب بتاتے جائیں وہ یہی کہتا جائے کہ صاحب یہ بھی نہیں ہوتی یہ بھی نہیں ملتی۔ آخر حکیم صاحب نے جھلا کر کہا کہ آخر تیرے گاؤں میں کچھ ہوتا بھی ہے۔ اس نے کہا ہمارے ہاں تو بینگن ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا خبردار بینگن ہرگز مت کھانا۔ سخت نقصان کرے گا۔ کہا کریلہ ہوتا ہے۔ کہا یہ بھی مت کھانا۔ مسور کی دال ملتی ہے۔ دیکھو یہ بھی مت کھانا۔ اب وہ دیہاتی صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر گئے اور کہنے لگے بس جی دیکھ لیا حکیم صاحب کو اس قدر تشدد ہے اس قدر تنگی ہے کہ جس چیز کو پوچھو یہ بھی مت کھانا، جس چیز کو پوچھو یہ بھی مت کھاؤ اور ایسی چیزیں بتلا دیں جو ہمارے گاؤں میں ہوتی ہی نہیں۔ ان کا علاج بڑا سخت ہے ان کے علاج میں بڑی تنگی ہے سب یہی کہیں گے احمق کو کہ حکیم صاحب کے علاج میں تو تنگی نہیں انھوں نے

تو دس چیزیں بتائیں لیکن اب وہ اس کو کیا کریں کہ تیرے گاؤں ہی میں مضر چیزوں کے سوائے کوئی مفید چیز نہیں ملتی۔ تو تیرے گاؤں میں تنگی ہے احمق نہ کہ حکیم صاحب کے علاج میں اب جتنی ترقی کی صورتیں ہیں ان میں سے شریعت نے سیکڑوں چیزوں کو جائز قرار دیا ہے اور بہت کم صورتوں کو ناجائز بتلایا ہے لیکن اب دوسرا وہ معاملہ تو کرے جو ناجائز ہے اور وہ معاملہ نہ کرے جو جائز ہے تو سبب تنگی کا وہ ہے یا دین اور یہ یقینی بات ہے جو تنگی پیش آتی ہے یا تو اہل معاملہ کی وجہ سے پیش آتی ہے جیسا ابھی ذکر ہوا اور یا آپ کی کم فہمی کی وجہ سے پیش آتی ہے تو اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہوئے یا دین تو غرض دین فی نفسہ اتنا آسان ہے کہ اس میں شائبہ بھی تنگی کا نہیں لیکن ہم نے خود اس آسان کو اپنے سوء استعمال سے دشوار بنا رکھا ہے۔ اب اس کا کیا علاج مثلاً نماز پڑھنا ہے یہ بھی کیسی مشکل ہے کہ اٹھ کر چند سہل اعمال کر لئے ویسے بھی تو تاجر صاحب دبجے سو کر اٹھتے ہیں کبھی بہت سا وقت تجارت سے خالی رہتا ہے سو اگر اس درمیان میں ذرا سویرے اٹھ کر فجر کی نماز ہی پڑھ لیتے تو اس میں کونسا خلل تھا تجارت کا۔ اسی طرح دین کی ساری باتیں آسان ہیں نماز بھی روزہ بھی مگر ہم نے خود اُن کو مشکل بنا رکھا ہے بلکہ زیادہ تر تو سبب تنگی کا کم ہمتی ہے جیسے مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں ایک اہدیوں کی جماعت تھی ان کی ایک یوں ہی افواہی حکایت سُنی ہے کہ دو شخص تھے ایک تو بیٹھا ہوا تھا اور ایک لیٹا ہوا۔ ایک سوار کا وہاں گذر ہوا۔ لیٹے ہوئے نے پکار کر کہا کہ میاں سوار ذرا یہاں تو آنا۔ وہ آیا کہ نہ معلوم بے چارے کو کیا حاجت ہوگی۔ پوچھا کہ کیا کام ہے۔ کہا میاں یہ جو میرے سینہ پر ایک بیر پڑا ہوا ہے گھوڑے سے اُتر کر ذرا میرے منہ میں ڈال دو۔ سوار نے کہا لاحول ولا قوۃ میں تو سمجھا تھا کہ معلوم کیا ضروری اور مشکل کام ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ خواہ مخواہ میرا راستہ کھوٹا کیا۔ ارے بھلے مانس تو خود اُٹھا کر منہ میں کیوں نہیں ڈال لیتا۔ کیا تیرے ہاتھ نہیں ہیں۔ اس نے کہا اجی صاحب بھلا کہاں ہاتھ سینہ

تک لے جاؤں اتنا بکھیڑا کس سے ہو اگر ذرا تمہیں ڈال دو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا صاحب انسان کو ایسا بھی بے مروت نہ ہونا چاہیئے۔ سوار سخت متحیر ہوا اس کے پاس والے سے کہا کہ ارے تو کس مصرف کا ہے تو بھی تو یوں ہی بیکار بیٹھا ہوا ہے تو ہی بیر اُٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دے اس نے بگڑ کر کہا کہ بس جی مجھ سے کچھ نہ بولو۔ نہیں تو لڑائی ہو جاوے گی تمہیں میرے دکھ کی میرے درد کی کچھ خبر بھی ہے۔ آئے اور بس رائے دیدی اس سے اور مجھ سے یہ معاہدہ ٹھہرا تھا کہ ایک دن ہم بیٹھیں اور تم لیٹے رہو اور ایک دن تم بیٹھو اور ہم لیٹے رہیں اور جو بیٹھا ہو وہ لیٹے ہونے کا کام کر دیا کرے۔ کل اس کے بیٹھنے اور میرے لیٹنے کا دن تھا مجھے لیٹے لیٹے جمائی آئی ایک کتا آکر میرے منہ میں موتنے لگا کہ بیٹھا دیکھتا رہا اور کُتے کو ہٹایا تک نہیں۔ اب میں اسے ضرور بیر کھلاؤں گا۔ سوار کی حیرت کی حد نہ رہی کہ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عالی ہمتی کا کہ منہ کے اندر کُتے کے موتنے میں بھی اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور ہٹا دے اور بیر اُٹھانے میں اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور اُٹھا کر منہ میں ڈال دے خود کون اُٹھائے احدیت میں فرق آجائے گا۔ خیر یہ تو واہیات گھڑی ہوئی حکایت ہے۔ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم تھے۔ یہ جماعت بھی بہت سُست ہے مگر غیر دنیا کے کاموں میں سُست ہو تو بودین میں سُست نہ ہو۔ ان کے حجرہ میں ایک چوہیا نے سوراخ کر لیا تھا اور بہت سی مٹی باہر نکال کر جمع کر دی تھی۔ وہاں ایک حاجی ہیں انہیں طالب علموں سے محبت ہے یگانگت کا برتاؤ رکھتے ہیں وہ ایک دن اُس حجرہ کے پاس ہو کر گذرے تو مٹی کا ڈھیر نظر آیا۔ خیر انھیں کچھ خیال ہوا سوراخ میں وہ مٹی بھر دی اور خوب ٹھوک پیٹ کر اسے بند کر دیا۔ اگلے دن چوہیا نے پھر مٹی نکال کر سوراخ کر لیا کسی نے کہا مٹی بھر کر ٹھیک کر دیا ہوتا تو آپ کیا فرماتے ہیں حاجی جی آکر کریں گے حاجی جی اب گویا ان کے نوکر ہو گئے ساری عمر کے لئے۔ تو حضرت دنیا میں ایسی ہمت کے ابھی لوگ موجود ہیں اسی طرح زیادہ سبب دین میں تنگی محسوس ہونے کا یہ کم ہمتی ہی ہے

ہم ان حکایتوں پر تو ہنستے ہیں لیکن دین کے اندر ہماری کم ہمتی کی بھی یہی حالت ہے ۔ میں سچ کہتا ہوں جن سے نماز روزہ نہیں ہوتا حضرت اگر حکام میں سے کوئی انہیں بلا دے جس کا قرب موجب عزت ہو تو جو عذرات نماز روزہ کے لئے ہو رہے ہیں ان میں سے جو ایک بھی باقی رہ جاوے جس وقت موذن کہے حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ یعنی نماز کے لئے آؤ اس وقت کہتے ہیں کہ بھائی ہم سے تو مسجد تک نہیں جایا جاتا ۔ کون اتنی دور جانے اور اگر کوئی اردلی آکر پیغام دے کہ صاحب کلکٹر نے آپ کو یاد کیا ہے تو فخر سمجھ کر فوراً چلنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے ۔ چار میل پر بھی ڈیرہ ہوگا تو وہیں جا کر مشغول ملاقات ہونگے اور آکر فخر کریں گے کہ ہمیں صاحب کلکٹر نے بلایا تھا تو یہ کیا بات ہے وہی شخص جو محلہ کی مسجد میں بھی نہ جا سکتا تھا اسے چار میل کے فاصلہ پر کس نے جا پہونچایا ۔ وہ کیا کہ مسجد تک جانے کا ارادہ نہیں کیا تھا اور وہاں جانے کا ارادہ کر لیا اسی ارادہ کا نام ہمت ہے تو ساری کمی ارادہ اور ہمت کی ہوئی ۔ واقعی حضرت قصد ہی نہیں ورنہ بڑے بڑے دشوار کام آسان ہو جاتے ہیں یہ قصد کا اثر نہیں تو اور کیا ہے کہ تجارت کے لئے کہیں افریقہ کہیں کہیں کہیں کہیں جا پہونچتے ہیں جو شخص مسجد میں نہ جا سکے وہ ایک دم سے ناٹال اور افریقہ پہنچے ۔

آخر کیا فرق رہا ہے ارادہ ہی کا تو فرق ہے لے حضرت اگر ارادہ دین کا کر لو اور پھر کوئی دشواری پیش آئے اُس وقت تو ہم جواب کے ذمہ دار ہیں اور مشورہ کے باقی جتنی بھی دشواریاں اب پیش کی جا رہی ہیں ابھی ان کے جواب کا وقت نہیں نہ سوت نہ کپاس جولاہے سے ٹھینگم ٹھینگا ۔ یہ سب سوال و جواب اور قیل و قال ایسی ہے جیسی افیونیوں کی جس سے کچھ حاصل نہیں ۔ افیونیوں کو مٹھائی کا بہت شوق ہوتا ہے ۔ دو افیونی تھے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے ایک بولا یار گنوں کی کاشت کریں گے بڑا مزہ رہے گا ۔ گنا تڑاق سے توڑا اور چوسنے لگے دوسرا بولا ہاں یار بڑا لطف رہے گا تڑاق پڑاق توڑا اور چوس لیا ۔ اس پر پہلے نے بگڑ کر کہا کہ میں نے ایک ہی گنا توڑا تھا تو نے

دو کیوں توڑ لئے دوسرا بولا ہمارا کھیت ہے چاہے سڑ گھا دیں تو کون ہے روکنے والا تو بھی کھا لے ۔ بس جناب اسی بات پر لڑائی ہوگئی ۔ کوئی ان سے پوچھے ارے احمقو وہ گنے ابھی ہیں کہاں جن پر لڑائی بھی ہونے لگی ۔ غرض لڑائی اتنی بڑھی کہ مقدمہ قاضی کے یہاں پہونچا قاضی نے انھیں اس حماقت کی اس طرح سزا دی کہ دونوں سے کہا کہ پہلے اس کاشت کا محصول سرکاری داخل کروگے پھر مقدمہ کی سماعت کی جاوے گی ۔ چنانچہ جناب اس نے پہلے تو دونوں سے محصول داخل کرالیا ۔ پھر دونوں سے کہا کہ دیکھو خبردار برابر برابر گنے توڑا کرو ۔ یہ فیصلہ کر دیا ۔ خواجہ صاحب نے (یہ احقر کاتب وعظ کی طرف مزاحاً اشارہ تھا بحوالہ احقر کے سابق عہدہ ڈپٹی کلکٹری کے ۱۲ کاتب) بس اسی طرح دین کے متعلق سوال و اشکال تو بہت اور کام کے نام دم نکلتا ہے ۔ حالانکہ حالت ہونا یہ چاہیئے ؎

کارکن کار بگذر از گفتار   اندریں راہ کار باید کار

(باتیں چھوڑ کر عمل میں لگ ۔ اس طریق اُلفت میں صرف عمل ہے)

فرماتے ہیں شیخ شیرازی ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم   کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(یعنی راہ طریقت میں قدم رکھنا چاہیئے اور عمل کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ بغیر قدم رکھے عمل کے دعوے کی کوئی حقیقت نہیں) ۔

(چونکہ یہ شعر دوبارہ پڑھا گیا تھا اس لئے دوبارہ ہی لکھا گیا ۱۲ کاتب) خدا جانتا ہے خدا کے یہاں نہ مولویت کا دعویٰ کچھ کام دے گا اور نہ مشیخت کام دے گی ۔ اگر کام دے گا تو یہی کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دو جس کا نام ہے اسلام کامل بس یہ کام دے گا اور کچھ بھی نہیں تو خدا کے واسطے ہمتیں درست کر کے کامل اسلام اختیار کر لو اور دشواری کے وہم سے ہمت مت ہارو ۔ ذرا اختیار کر کے تو دیکھو میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں ۔ دیکھئے آدمی قسم جب ہی کھاتا ہے جب پورا بھروسہ ہو ۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ مجھے کوئی تو بھروسہ ہے

خود اپنا معائنہ مشاہدہ یا بزرگوں کی تقریر یا تقلید کسی چیز پر تو اطمینان ہے۔ جس پر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جتنی دشواریاں تمہیں دین میں اب نظر آ رہی ہیں اگر ارادہ کی تکمیل کر لو اور عمل شروع کر دو تو خدا کی قسم سب دشواریاں ہمیں نظر آ رہی تھیں وہ محض ہمارا وہم تھا اور کچھ بھی نہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ جنگل میں دیکھا ہوگا یا کسی پختہ سڑک پر دیکھا ہوگا کہ راستہ کے دونوں طرف درخت ہوتے ہیں اور دور تک نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر دونوں لائنیں درختوں کی مل گئی ہیں اور راستہ بند ہو گیا ہے یا سمندر کی سیر کو کبھی گئے ہوگے تو سمندر آسمان کے کنارہ سے ملا ہوا نظر آیا ہوگا یہ اور معلوم ہوتا ہوگا کہ بس آگے سمندر نہیں۔ اب فرض کرو ایک شخص ہے بالکل ناتجربہ کار جس کو کہیں کا تجربہ نہیں نہ بر کا نہ بحر کا۔ اس کو دریا میں لے چلے۔ ایک مقام تھا جہاں دریا کا بھی راستہ قطع کرنا تھا۔ اب وہ آسمان کے کنارہ کو پانی سے ملا ہوا دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ آگے چل کر راستہ بند ہے اور یہ سوچ کر کہ یہ سرپوش سا کیا ڈھکا ہوا ہے جہاز اس سے ٹکرا نہ جائے گا جہاز والے سے پوچھتا ہے کہ بھائی پہلے مجھے یہ تو بتا دو کہ کدھر کو جائے گا جہاز۔ تم چل تو رہے ہو مگر آگے راستہ ندارد۔ اب جہاز والا ہر چند کہتا ہے کہ بھائی تم چپکے تو چلے چلو راستہ صاف پڑا ہوا ہے میرا تو بارہا کا دیکھا ہوا ہے۔ میں تو رات دن کا آنے جانے والا ٹھہرا اور تم نے کبھی دریا کا سفر کیا نہیں اس لئے یوں سمجھ رہے ہو کہ راستہ بند ہے لیکن دراصل یہ بات نہیں۔ تمہیں تجربہ نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ نہیں جناب پہلے ہمیں سمجھا دو تب چلیں گے کیونکہ ہمیں تو کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے کہ آگے چل کر راستہ بند ہے۔ خیر ابھی تو دس میل ہی آئے ہیں پھر دور پہونچکر لوٹنا پڑا تو طوالت ہوگی۔ یہیں سے واپس چلے چلو اب کیا اس احمق کے کہنے سے جہاز والا اپنا جہاز پیچھے کو ہٹائے گا۔ یا کوئی اسی طرح احمق ہو جس کی میں نے پہلے مثال دی تھی کہ سڑک پر دونوں لینیں درختوں کی ملی ہوئی ایسا دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے اور اپنے رہبر سے کہتا ہے کہ آگے چل کر

تو درخت مل گئے ہیں اور راستہ بند ہو رہا ہے تم کدھر لئے چل رہے ہو۔ وہ ہر چند کہتا ہے کہ درخت یہیں سے ملے ہوئے نظر آ رہے ہیں وہاں ملے ہوئے نہیں ہیں تم چلنا تو شروع کرو۔ راستہ ملے گا۔ اب وہ سنتا ہی نہیں۔ اب بھلا ایسے احمقوں کا کیا علاج اسی طرح اے صاحبو! جب تم نے چلنا شروع نہیں کیا ہے جبھی تک دین کے راستہ میں تمہیں پتھر اور پہاڑ نظر آ رہے ہیں۔ ارے بھائی تم چلو تو پھر جتنے پتھر اور پہاڑ ہیں سب خود بخود ہٹتے چلے جائیں گے اول تو اس راستہ میں پہاڑ ہیں نہیں ؎

اے خلیل اینجا شرار دود نیست　　　　جز کہ سحر و خدعۂ نمرود نیست

(یہ شعر دوبارہ پڑھا)

(اللہ کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور جو کسی کو رکاوٹ معلوم ہوتی ہے وہ نمرود جیسے سحر اور جادو کی شکل ہے)

اور جو پہاڑ تمہیں اس وقت نظر آ رہے ہیں وہ حقیقی نہیں ہیں خیالی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دین میں تنگی اور دشواری اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو ایسی برکت ہے طلب کی اور اخلاص اور رضا کی اور سچے اسلام کی کہ بڑے بڑے پہاڑ ھباءً منثورا ہو جاتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مگر یوسف (علیہ السلام) کی طرح بھاگ نکلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے)

ہائے کیا مضمون ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا بہانہ سے اپنے محل کے اندر لے گئی تو سات دروازے تھے اس محل کے۔ ہر ایک دروازہ کو بند کر کے اس میں ایک ایک قفل بھاری لگاتی چلی گئی۔ جب ساتوں دروازے مقفل ہو چکے تب اطمینان کے ساتھ اس نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ اب اگر بھاگنا بھی چاہیں گے تو بھاگ کر جائیں

گے کہاں۔ اس وقت اگر وہ ایسے ہی شکی ہوتے جیسے کہ ہم لوگ ہیں اور حق تعالیٰ پر پورا توکل نہ ہوتا تو بھاگنے کی کوشش ہی نہ کرتے مگر خدا پر توکل کر کے بھاگے کہ میں اپنا کام تو کروں وہ اپنا کام کریں گے۔ جو کام میرے اختیار میں ہے وہ تو مجھے پورا کرنا چاہیئے۔ بس جناب دوڑنا تھا اور قفلوں کا خود بخود ٹوٹ کر نیچے گرنا اور پٹوں کا کھلنا غرض ایک۔ ٹوٹا دوسرا ٹوٹا تیسرا اسی طرح ٹوٹا پھر چوتھا پھر پانچواں غرض سارے قفل ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام ساتوں دروازوں کو پار کر کے باہر ہو گئے تو مولانا اس کو یاد دلا کر فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی گو نفس و شیطان سے بچ کر نکلنے کا راستہ تو دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا لیکن تم خدا پر بھروسہ کر کے دوڑ دو دیکھو اللہ میاں غیب سے راستہ پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔ ارے بھائی تم تو اپنی سی کوشش کرو اور اصلاح کا ارادہ تو کرو پھر کوئی اشکال پیش آوے تو پیش کرو۔ کام کرنے سے پہلے تو یہ باتیں کرنا فضول ہیں مجھے ایک جواب اپنے استاد مولانا محمد یعقوب قدس سرہ العزیز کا بہت پسند آیا جو انھوں نے ایک طالب علم کو دیا تھا دیکھئے اہلِ مناظرہ کے جواب اور قسم کے ہوتے ہیں۔ اہلِ حقیقت کے اور قسم کے۔ اہلِ مناظرہ کے جواب تو بس زبان ہی تک رہتے ہیں اور اہلِ تحقیق کے جواب قلب تک اترتے ہیں۔ دورانِ درس میں ایک طالب علم نے ایک حدیث پر شبہ کیا تھا اس کا جواب مولانا نے دیا تھا۔ حدیث یہ ہے کہ جو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ایسے پڑھے کہ لَا یُحَدِّثُ فِیْھِمَا نَفْسَہٗ یعنی اس میں اپنے جی سے باتیں نہ کرے یعنی حدیث النفس کے طور پر جو ہم لوگ۔ ادھر اُدھر کی باتیں سوچا کرتے تھے اس سے وہ نماز بالکل خالی ہو۔ بے سوچے اگر ادھر اُدھر کے خیالات آجاویں تو کچھ ڈر نہیں مگر خود نہ سوچے اور بے سوچے آنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ انھیں دل میں رکھے بھی نہیں یعنی احداث

اور ابقاء دونوں اس کی جانب سے نہ ہوں۔ یعنی نہ خود پیدا کرے نہ خود باقی رکھے۔ بس متوجہ الی اللہ رہے اور اگر کوئی خیال خود بخود آجائے تو کچھ حرج نہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ نماز میں حضوری بہت آسان ہے جس کو لوگوں نے خواہ مخواہ مشکل سمجھ رکھا ہے تو مولانا کی خدمت میں یہ حدیث ہو رہی تھی کہ جو ایسی دو رکعت پڑھ لے گا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ یعنی اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ایک طالب علم بولا کیوں حضرت کیا ایسی نماز ممکن ہے جس میں خیالات نہ آویں اول تو اس نے سوال ہی غلط کیا حدیث شریف میں تو یہ ہے کہ لَا یُحَدِّثُ فِیْھِمَا نَفْسَہٗ لَا تَتَحَدَّثُ فِیْھِمَا نَفْسُہٗ مگر مولانا نے اس مواخذہ سے تعرض نہ فرما کر کیا خوب جواب دیا کہ میاں کبھی ارادہ بھی ایسی نماز پڑھنے کا کیا تھا جس میں کامیابی نہ ہوئی۔ کبھی پڑھ کر بھی دیکھی تھی، اگر پڑھ کر دیکھتے اور ناکامی ہوتی تب تو پوچھتے ہوئے بھی اچھے معلوم ہوتے۔ شرم نہیں آتی کہ کبھی ارادہ تو کیا نہیں اور پہلے ہی اعتراض کرنے بیٹھ گئے حدیث پر بھائی، کبھی اس حدیث پر عمل تو کر کے دیکھا ہوتا۔ جب قدرت نہ ہوتی تب بھی اعتراض کیا ہوتا۔ سو واقعی اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے پلاؤ کی تعریف کی کہ بڑا لذیذ ہوتا ہے یہ سُن کر ایک کہتا ہے جو ہمیشہ ستو ہی گھول گھول کے پیتا رہا ہے کہ پلاؤ گلے سے اُترے گا کیونکر لمبے لمبے چاول کانٹے سے کانٹے سے پھر لقمہ میں بہت سے اور جو پھنس جائیں تو مثلاً ایک لقمہ میں ۴۰ چاول ایک دم سے آگئے وہ کانٹے کی طرح لمبے نوکدار اور حلق کا ذرا سا سوراخ۔ بھلا لقمہ اُترے گا کیسے آپ نے یہ بات حکیم جی سے پوچھی کہ صاحب ذرا مجھے سمجھا دیجئے کہ پلاؤ کا لقمہ گلے سے اُترے گا یا نہیں۔ کوئی پتلی چیز ہوتی تو اُتر بھی جاتی۔ اب حکیم صاحب سمجھانے بیٹھے کہ دیکھو یہ صورت اُترنے کی ہو گی کہ یہاں تو یہ چاول لمبے لمبے نظر آرہے ہیں وہاں پہونچ کر گول ہو جائیں گے وہاں حلق کے اندر تخلخل ہو جائے گا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا اشکالات پر اشکالات

بس سیدھا جواب یہ ہے کہ ارے احمق کھا کر تو دیکھ جس وقت اٹھے گا اُسی وقت پوچھیے اصلی جواب تو یہی ہے۔ حضرت ان بزرگوں کے جواب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ پھر کسی کو گنجائش ہی کلام کی باقی نہیں رہتی۔ سُنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک۔ بھلا کیا منہ رہا اس طالب علم کا کہ پھر کوئی اشکال پیش کر سکے مولانا کے جواب کے بعد واللہ اگر مولانا حقیقت سمجھانے بیٹھ جاتے اس طالب علم کو تو ہزاروں شبہات پیش آتے۔ اس کا شبہ تو کام کرنے ہی سے رفع ہو سکتا تھا۔ اس کا شبہ علمی تقریر سے دور نہ ہوتا کیونکہ جو عملی کام ہیں ان میں جو شبہات پیدا ہوں وہ عمل ہی کرنے سے زائل ہوتے ہیں ورنہ نری علمی تحقیقات سے کچھ کام نہیں چلتا۔ تو بزرگوں کے جواب جو جناب ایسے ہی ہوتے ہیں اور حقیقت میں صحیح جواب یہی ہیں، اسی طرز پر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تکمیل اسلام یعنی اسلام کامل حاصل کرنے کا ارادہ کر لو پھر اگر نا کافی ہو تب تو کچھ اچھے بھی معلوم ہو کوئی اشکال پیش کرتے ہوئے اور ارادہ کرنا کیا مشکل ہے کر کے تو دیکھو حاصل یہ کہ واقع میں ارادہ کے بعد جب دین میں کچھ دشواری نہیں اور دین ہے اسلام اور اسلام کی حقیقت ہے سُپرد کرنا اور وہ ہے آسان تو بس اپنے کو خدا تعالیٰ کے سُپرد کر دو اب یہ سمجھنا باقی ہے کہ سُپرد کرنا کسے کہتے ہیں سو اس کے لئے ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں دیکھئے وکیل کے سُپرد جو مقدمہ کر دیا جاتا ہے تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں یہی معنے ہوتے ہیں کہ بس اب تم اس میں کوئی دخل مت دو۔ اب مقدمہ جانے اور وکیل جانے۔ اور وکیل بھی خاص کر جبکہ معتمد بھی ہو۔ کارساز بھی ہو۔ خیر خواہ بھی ہو دانا بھی ہو قادر بھی ہو۔ بعض وکیلوں میں تو یہ بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ کبھی شاید قانون نہ جانتا ہو شفقت میں کمی ہو اور جہاں ایسا ہو جیسے بیٹے کا تو مقدمہ اور باپ وکیل یا جیسے کوئی مریض اپنے آپ کو ایسے حکیم کے سپرد کر دے کہ وہ طبیب بھی ہے اور باپ بھی ہے اور طبیب بھی ایسا کہ حکیم محمود خاں سے سند حاصل کئے ہوئے۔ اس کے

سپرد کرنے کے کیا معنی ہوں گے۔ یہ معنے ہوں گے کہ تم مت دخل دو اور دخل نہ دینے کے کیا معنی یہ کہ اگر مریض کچھ کھاوے تو حکیم جی سے پوچھے نسخہ پیوے تو حکیم جی سے پوچھے۔ میں جب بیمار پڑتا ہوں تو ایسا کرتا ہوں کہ کوئی ایک طبیب اپنے علاج کے لئے تجویز کر لیتا ہوں اور سُپرد کرنے کے اس معنے پر اس طرح عمل کرتا ہوں کہ اگر کوئی بھی کچھ بتلاتا ہے کیونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب محبت ہوتی ہے تو نفع کی چیز بتانے کو ہر شخص کا جی چاہتا ہے۔ تو میں کسی کی دل شکنی نہیں کرتا۔ کہہ دیتا ہوں کہ بھائی فلانے حکیم میرے معالج ہیں تم ان کو کہہ دو انھیں سمجھا دو اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو مجھے بھی کوئی عذر اس کے استعمال میں نہ ہوگا اگر ایسا نہ کروں تو میں کس کس کا علاج کروں کیوں کہ محبت میں ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور بتانے لگتا ہے اسی واسطے میں کہتا ہوں ضرورت اس کی ہے کہ ایک خدا کو اختیار کر لو ہم نے پچاس اللہ اختیار کر رکھے ہیں کہیں نفس کہیں برادری کہیں قوم کہیں روپیہ، کہیں کچھ کہیں کچھ۔ سب کو راضی نہیں کر سکتے بس ایک کو لے لو ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہ ہے کہ سارے جہاں کی مصلحت چھوڑ کر دوست محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

اور یہ مشرب ہونا چاہیئے مسلمان کا ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے　　چہ کنم کہ چشم بدبیں نہ کند بکس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند ہی کے خیال میں مست ہوں۔ کیا کروں میں، کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑتی)

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لئے تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)
اور حضرت خدا کے ساتھ تو یہ علاقہ کیوں نہ ہونا چاہیئے لوگوں نے تو مخلوق کے ساتھ یہ علاقہ پیدا کر لیا ہے۔ اب آخر مجنوں کا قصہ معلوم ہی ہے سب کو لیلیٰ مورخین نے لکھا ہے کہ سانولی تھی۔ بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن دل ہے جہاں آگیا۔ ایک حکایت مولانا نے لکھی ہے ؎

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی   کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

بادشاہ وقت نے جب لیلیٰ کی تعریف سنی تو حکم دے دیا کہ بلالو۔ چنانچہ وہ حاضر کی گئی دیکھا تو ایک سانولی سی عورت۔ کہا ماشاء اللہ آپ ہی ہیں جنھوں نے مجنوں کو پریشان کر رکھا ہے ؎

از دگر خوباں تو افزوں نیستی   گفت خاموش چوں تو مجنوں نیستی

یعنی اوروں سے زیادہ تو کوئی بات تجھ میں نہیں معلوم ہوتی۔ لیلیٰ نے کہا چپ رہ تو مجنوں تھوڑا ہی ہے ؎

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا   ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

اگر تیرے پاس مجنوں کی آنکھ ہوتی تو اس وقت تیری نظروں میں دونوں عالم بے قدر ہوجاتے تو حضرت جس کا حسن ادنیٰ درجہ کا ہے اس کی محبت میں تو طالب کی یہ حالت ہو جائے کہ دونوں عالم اس کی نظروں میں بے قدر ہوجائیں اور آپ خدا کی محبت میں اتنی حالت بھی نہ کر دکھلاویں افسوس ؎

عشق مولا کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

کیونکہ عشق کا مدار حسن ہے اور حسن کہاں خدا کا کہاں لیلیٰ کا۔ حسن مجازی تو ایک پرتو ہے حسن حقیقی کا سو دنیا کا حسن و جمال وہیں کا ظل ہے۔ انہی کو کہتے ہیں ایک عارف ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ   پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(مجنوں کی شکل میں تو نے اپنے کو ظاہر کیا ہے۔ اور چشم عاشقاں کو تو نے

اپنے لئے تماشا بنایا ہے)
تو ایسی حالت میں غضب کی بات ہے کہ خدا کے ساتھ وہ علاقہ نہ ہو جو مجنوں نے لیلیٰ کے ساتھ کر کے دکھایا۔ یعنی اپنے کو ہمہ تن فنا کر دیا محبت لیلیٰ میں۔ حقیقت میں سپرد کرنا وہی ہے جس کو فنا ہوجانا کہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسلمان فنا ہوجائے۔ فنا ہوجانے کے یہ معنے نہیں کہ سنکھیا کھالے۔ گلا گھونٹ لے۔ مرجاوے۔ اجی حضرت وہ تو چیز ہی اور ہے وہ کیا چیز ہے وہ تو ایک ہی کا ہو رہنا ہے ایک ہی کی سپردگی میں اپنے آپ کو دے دینا ہے، ایک ہی کی اطاعت اختیار کرلینا ہے۔ پھر بھلا اس فنا میں مرنا کہاں بلکہ اس کا تو یہ اثر ہے ؎

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

(خنجر تسلیم کے زخمیوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)۔
اور اس فنا کی تو یہ حالت ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   انچہ در وہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا)
تو فنا کے یہ معنے نہیں ہیں کہ مرجاؤ بلکہ یہ معنے ہیں کہ اپنی رائے کو چھوڑ دو۔ اپنے ارادہ اور آرزو کو چھوڑ دو۔ وہ حالت کر لو جیسی کہ حضرت عارف شیرازی نے بیان فرمائی ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں۔ اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)
اب بھلا رائے کا چھوڑ دینا بھی کوئی مشکل کام ہے بلکہ اس میں تو بڑی راحت ہے۔ لیجئے صاحب یہ ہے دین اور یہ ہے اسلام جو مطلوب ہے جس کو لوگ مشکل مشکل کہہ رہے ہیں۔ کس قدر آسان نکلا۔ بس اس کی تعلیم کرنے میں لوگ ہم ملانوں کو بدنام کرتے ہیں کہ تشدد

کرتے ہیں مشکل کام بتلاتے ہیں اسی کی تعلیم کرتے ہیں لوگ ہم میں طرح طرح کے عیب اور نقصان نکالتے ہیں واقعی ہم میں ایک عیب ضرور ہے کہ ہم نے خدا کے دین کو بہت آسان اور مختصر کر کے مخلوق کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ ادنیٰ توجہ سے ہر شخص کو دسترس ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل ہے یا آسان ہے اور کرنے سے پہلے یہ سارے خوف اور وہم ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی مریض کو طبیب نے علاج کی رائے دی اب اس کو حقیقت تو معلوم نہیں علاج کو دشوار سمجھ کر کہتا ہے کہ صاحب کہاں دوائیں لاؤں کہاں اہتمام کروں کہاں بکھیڑا کروں وہ ہنس کر کہنے لگا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی علاج کیا نہیں اچھا تم اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر دو اور تندرستی لے لو۔ اس نے کہا اچھا صاحب کر دیا سپرد کر کے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی چیز ایسی نہیں تجویز کی جو مشکل ہو۔ نسخہ بھی وہ لکھا جو شہر میں ملتا ہے۔ غذا بھی وہ بتائی جو شہر میں ملتی ہے۔ نسخہ کے دام بھی وہ جو وسعت سے زیادہ نہیں کیونکہ کامل طبیب مفردات سے علاج کرتا ہے یا دو تین اجزاء سے اور معمول کے مطابق جو غذا مریض کھاتا ہے اسی کو برقرار رکھتا ہے البتہ اس میں کچھ اصلاح کر دیتا ہے۔ ایسا طبیب حاذق اتفاق سے اس مریض کو مل گیا۔ آٹھ دس دن ہی علاج کیا تھا کہ نہ بخار رہا نہ کھانسی رہی۔ بالکل تندرست ہو گیا۔ طبیب نے پوچھا کہو بھائی تم تو کہتے تھے کہ علاج بڑا مشکل ہے۔ کہا میری حماقت تھی۔ میں نے باقاعدہ علاج کبھی کیا نہ تھا۔ سن سن کر اوہام میں مبتلا ہو گیا تھا یہ تو بڑا آسان نکلا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسی طرح اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر کے دیکھو کتنا آسان ہے سارا قصہ البتہ یہ ضرور ہے کہ خواہ علاج کتنا ہی آسان ہو مگر عادات و معمولات میں کچھ نہ کچھ ترمیم ضرور کی جاتی ہے مگر وہ بھی دشوار نہیں ہوتی۔ جیسے مشفق طبیب یوں تو نہیں کہتا کہ تم بیوی کو طلاق دے دو۔ بچوں کو چھوڑ دو۔ مال اسباب کو خیرات کر ڈالو۔ سب حالت بدستور رہنے دیتا ہے ہاں معمولات میں تھوڑی سی درستی کر دیتا ہے جب شفیق طبیب ایسا کرتا ہے حق تعالیٰ کی برابر تو نہ ماں رحیم ہے نہ باپ ان کی تجویز تو سب ہی سے زیادہ سہل ہوگی چنانچہ دیکھ لیجئے حق تعالیٰ نے جو احکام ہمارے

لئے تجویز فرمائے ہیں خود انہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری کس قدر سہولت اور رعایت مدنظر رکھی ہے مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اگر پانی نہ ہونے کی وجہ سے غسل یا وضو نہ ہو سکے اور سونے سے وضو یا سوتے ہوئے احتلام ہو جانے سے غسل واجب ہو گیا تو تیمم کی اجازت ہوتی ہے لیکن اس میں ایک بات کمال کی ہے۔ یعنی عجیب قصہ ہے کہ اگر سفر میں پانی وضو کے لائق تو ہو لیکن غسل کے لائق نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن پانی سے غسل کرنا مضر ہو تو ظاہر عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے وقت میں صحبت کی اجازت نہ ہونی چاہیے کیونکہ خواہ مخواہ بیوی سے مشغول ہو کر قصداً تو ناپاک بنے اور اب پانی ڈھونڈھتے ہیں تو ملتا نہیں یا ملتا ہے مگر عذر ضرر کا کرتے ہیں پھر پوچھتے ہیں کہ صاحب تیمم جائز ہے یا نہیں۔ ایسے موقع پر شریعت کو حق تھا کہ کہہ دیتے کہ تمہیں قصداً ناپاک بننے کو کس نے کہا تھا جاؤ ہم تیمم کی اجازت نہیں دیتے۔ سر کھاؤ اپنا۔ مرد جب وقت پاک تھے اس وقت معلوم تھا کہ پانی غسل کے لائق نہیں ہے یا غسل مضر ہوگا پھر ضرورت کیا تھی خواہ مخواہ مجبور بننے کی۔ ہم اجازت نہیں دیتے چنانچہ دنیا میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے رخصت مانگی اپنے آقا سے اس نے ذرا انکار کیا کہ جھٹ ایک دوا ایسی پی لی جس سے بخار چڑھ آیا آقا کو پتہ لگ گیا کہ اس نے قصداً بغرض حصول رخصت بخار چڑھا لیا ہے۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ ہم کبھی تم کو رخصت نہ دیں گے۔ دیکھئے دنیا میں تو یوں واقع ہو رہا ہے اور عقل کے بھی خلاف یہ بات نہیں لوگ بہت عقل عقل کرتے پھرتے ہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری رائے اور عقل جس کے تم بڑے معتقد بن رہے ہو تمہاری دشمن ہے چنانچہ مثال مذکور میں عقل صحبت کی اجازت نہیں دیتی مگر شریعت نے عقل کے تشدد کو پسند نہ کر کے سہولت کا مشورہ دیا اس آیت میں یہی مضمون ہے وَاعْلَمُوٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ یعنی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے کہنے کے موافق کرتے تو تم مشقت میں پڑ جاتے وجہ یہ ہے کہ یہی ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے مصلحت کیا ہے۔ غرض خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں ہماری ہر طرح کی مصلحت اور رعایت

ملحوظ رکھی گئی ہے ایسی کہ خود ہماری عقل بھی اتنی رعایت تجویز نہیں کرتی۔ تو حضرت عقل کو چھوڑیئے اس کی بڑی پرستش کرتے تھے مگر دیکھئے عقل کا فتویٰ اس موقع پر یہ ہے کہ تیمم کی اجازت نہ ہو کیونکہ جب پانی موجود نہ تھا یا مضر تھا تو قصداً اپنے اوپر غسل واجب کیوں کیا۔ اب شریعت کا فتویٰ سُنیئے۔ مثلاً ایک ایسا ہی شخص پوچھتا ہے کہ ایسی صورت میں غسل کا تیمم کر کے نماز پڑھنا مجھے جائز ہے۔ شریعت کا نائب کہتا ہے کہ ہاں ہاں جائز وہ شخص پوچھتا ہے کہ ایک شخص کو یہ معلوم تھا کہ پانی نہیں ہے۔ باوجود اس کے اس نے اپنی بیوی سے مشغول ہو کر اپنے اوپر غسل واجب کر لیا کیوں جی اس کو کچھ گناہ ہوا کچھ کراہت ہوئی۔ وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کیوں صاحب تیمم میں کچھ بھی نقصان رہے گا وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ یہ میں نے ایک چھوٹا سا نمونہ بتایا ہے اسی سے اندازہ کر لیجئے شفقت کا۔ پھر بھی اگر اپنے کو خدا تعالےٰ کے سپرد نہیں کرتے تو کون آوے گا جس کے سپرد اپنے آپ کو کرو گے۔ غرض جس طرح طبیب کے سپرد اپنے آپ کو کرتے ہو اسی طرح اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دو۔ یعنی اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا اس میں تھوڑا سا تصرف کرنا ہوگا۔ میں بہت چھوٹی سی بات تبلاؤں گا تفصیل آپ سے آپ وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔ میں ایسا گر تبلاؤں گا جس سے ہر وقت ذہن میں تفصیل کے جمع رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ تفصیل خود بخود وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔ وہ گُر یہ ہے کہ اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرا لیتے ہو۔ جو جی میں آتا ہے کہہ سُن لیتے ہو جو جی میں آتا ہے کھا پہن لیتے ہو۔ جو جی میں آتا ہے خرید بیچ لیتے ہو۔ اب تو یہ حالت ہے اور فنا کے یہ معنے ہیں کہ جو جی میں آیا اسے فوراً کرنے نہ بیٹھ جاوے بلکہ ذرا رُکے۔ یعنی جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ دل میں پیدا ہو اسے فوراً نہ کرو بلکہ اس کا حکم پوچھئے عاملان شریعت سے کہ وہ کیا کہتے ہیں سو پوچھنے پر معلوم ہوگا کہ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ گوشت گھی مت کھاؤ نکاح مت کرو۔ بچوں کو پیار مت کرو۔ کیا کہا ہے فقط یہ کہا ہے کہ وہ کام نہ کرو جس میں تمہارا ضرر ہے مگر اس کا فیصلہ تمہاری رائے پر نہیں رکھا

اگر بچہ کی رائے پر ماں باپ اسے چھوڑ دیں تو اس کا نتیجہ بچہ کی ہلاکت ہے مثلاً بچہ نے سانپ کو دیکھا کہ چمکتا ہوا اور منقش ہے وہ اس کی ظاہری خوبصورتی اور نقش و نگار کو دیکھ کر اس کے پکڑنے کے لئے لپکا۔ باپ ہر چند اسے روکتا ہے لیکن نہیں مانتا ہٹاتا ہے لیکن اصرار کرتا ہے جب کسی طرح نہ مانا تو زور سے ایک چپت لگایا اور زبردستی پکڑ کر گھسیٹ لے گیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اس نے جو یہ دھول مارے آیا یہ رحمت اور شفقت ہے یا تشدد اور بے رحمی ہے اور اگر فرض کرو اتفاق سے اس بچہ کو اپنی رائے پر عمل کرنے کی وہ باپ اجازت دیدے تو ظاہر ہے کہ سانپ اسے کاٹ لے گا اور وہ مر جاوے گا تو پہلی صورت میں گدھے سے گدھا بھی کہے گا کہ سُبحان اللہ کیا مہربان باپ ہے۔ بڑی نگرانی اور بڑی محبت سے اپنے بچہ کو پالا ہے اور اگر بچہ کے کہنے پر کہ سانپ کو پکڑ لوں باپ نے اجازت دے دی اور کہہ دیا کہ ہاں پکڑ لے بیٹا اور بچہ کا دل نہ دُکھایا تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی اس کو مہربانی نہ تبلاوے گا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ محبت یہی تھی کہ چپت لگاتا اور سانپ نہ پکڑنے دیتا۔ وہ ظالم تھا ڈاکو تھا خونخوار تھا باپ نہ تھا۔ پھر خدا کو جو باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے آپ چاہتے ہیں کہ جو ڈاکو باپ نے کیا وہی وہ کرتا یعنی ہمیں اجازت دے دیتا کہ جو جی میں آوے کرو۔ اب انصاف کے ساتھ فیصلہ اپنے نفس سے کرو کہ کون سی صورت مہربانی کی ہے آیا یہ کہ کبھی کبھی چپت لگا دیا کریں وہ بھی جب کہنا نہ مانو اور اگر کہنا مانو تو پیار پر پیار۔ محبت پر محبت۔ اور وہ مار بھی شفقت ہے مگر حساً نہیں۔ تو یہ ہے وہ گُر۔ گویا سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہے۔ یہاں غالباً آپ ایک شبہ یہ پیش کریں کہ جب ہماری مرضی کے موافق نہ ہوں گے تو ہمیں تکلیف ہوگی اور ہمارا حرج ہوگا مگر ذرا ٹھہر کر اور سوچ کر کہیئے جو کچھ کہنا ہو اوّل تو ہر جگہ یہ کہنے کا منہ نہیں کہ تکلیف اور حرج ہوگا مثلاً جی چاہا ڈاڑھی ذرا صفا چٹ کر دیں گورے معلوم ہوں گے۔ حسین معلوم ہوں گے تو میاں تبلایئے اگر شریعت کی ممانعت پر عمل کیا تو کون سی تکلیف ہوئی کون سا حرج ہوا البتہ ایک تاجر تو خیر کہہ سکتا ہے کہ سود

کو چھوڑدوں تو مالی حرج ہوگا۔ یہ تو خیر کچھ معقول بھی ہے گو انشاء اللہ اس کا جواب بھی ایسا بتلادوں گا جس سے یہ اعتراض ماکول ہوجاوے گا مگر خیر ظاہراً تو کچھ ہے لیکن شریعت اگر ڈاڑھی منڈانے کو منع کرے شریعت اگر غیبت کو منع کرے شریعت اگر انگریزی لباس پہننے سے منع کرے تو اس میں کون سا ضرر ہوگا۔ اگر اس میں دعویٰ تکلیف اور حرج کا ہو تو میں کہتا ہوں وہ ہیں کا نام بتادیجئے کہ وہ تکلیف اور حرج کیا ہے۔ اگر تکلیف اس کو کہتے ہو کہ خیال کے خلاف ہے تو حضرت یہ جو گورنمنٹ کی نوکری ہے۔ یہ تو اس میں بھی ہے کہ آفس میں جانا ہے لیکن بارش ہورہی ہے تو نوکری بھی مت کرو۔ دنیا کا کون سا ایسا کام ہے جو نفس سے بالکل خلاف نہ ہو۔ خلاف تو ہزاروں باتیں ہیں۔ مثلاً تار آیا کہ بیٹا بیمار ہے لیکن کچہری جانا ضرور۔ یہ بھی نفس کے خلاف ہے مگر اور جگہ اعتراض نہیں کرتے۔ قانون سرکاری تو یہ کہتا ہے کہ کیسا بیٹا کام پر حاضر ہونا پڑے گا اس کو کوئی نہیں کہتا کہ کیسا سخت قانون ہے کہ ہم تو بیٹے کے غم میں پڑے ہوئے ہیں وہاں دفتر سے یہ حکم چلا آرہا ہے کہ آؤ جی گھر سے نکل کر تو جناب ایسا قانون تو کوئی دنیا میں بھی نہیں جس میں نفس کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو پھر نہیں معلوم اللہ میاں کے قانون ہی کو کیوں ہر بات میں سخت بتایا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت نے ڈاڑھی منڈانے سے منع کردیا تو اس میں تکلیف اور حرج کیا ہوگیا کہیں چوٹ لگ گئی (بلکہ منڈانے میں تو استرہ لگ جانے کا خوف بھی ہے ۱۲ کاتب) آمدنی گھٹ گئی سردی لگنے لگی گرمی لگنے لگی کیا ہوگیا ہاں یہ تو ہوا کہ بزعم تمہارے صورت اچھی نہ رہے گی سو اول تو یہ ضرور نہیں کہ ڈاڑھی سے صورت بری معلوم ہونے لگتی ہو ڈاڑھی کوئی دُم ہے کہ چہرہ پر بری معلوم ہو لاحول ولاقوۃ بلکہ واقعی اگر شریعت کی حد میں ہو تو چہرہ کی زینت ہے یوں کوئی ایڑی تک بڑھالے یہ اس کی ہمت ہے۔ اختیار ہے باقی شریعت نے مجبور صرف ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنے پر کیا ہے۔ اور ایک مٹھی ڈاڑھی تو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ خوب صورت نہ بھی معلوم ہو تو کس کی نظر میں خوبصورت نہیں

معلوم ہوتی صرف چند احمقوں کی نظر میں باقی جس کے ساتھ اصل تعلق ہے یعنی حق سبحانہ تعالیٰ انھیں تو خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بلا تشبیہ اگر کسی بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہوجائیں اور وہ عورت یوں کہے کہ تم ڈاڑھی نہ منڈایا کرو مجھے تو ڈاڑھی اچھی معلوم ہوتی ہے تو اگر وہ صاحب سچے عاشق ہیں تو خدا کی قسم اسی دن سے ڈاڑھی منڈانا چھوڑدیں گے۔ اب اُن کے دوست احباب ہنستے ہیں کہ آیئے مولوی صاحب آیئے ملّاں صاحب لیکن وہ عاشق صاحب بجائے متاثر ہونے کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ میاں تم کیا جانو اس ڈاڑھی کی حقیقت تمہیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو لیکن اسے تو اچھی معلوم ہوتی ہے جس پر میں جان تک فدا کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے اب کسی سے کیا مطلب اب تو میں نے یہ مذہب اختیار کرلیا ہے ؎

دلآرامے کہ داری دل در و بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اب تو میری حالت اس نوخرید غلام کی سی ہے جس سے اس کے نئے آقا نے اس کا نام اور کھانے پہننے کے متعلق معمول پوچھا تھا اور اس نے اپنے آقا کے پوچھنے پر یہ جواب دیا تھا کہ اب تک جو کچھ بھی میرا نام ہو لیکن آج سے جو تم مجھے کہنے لگو وہی میرا نام ہے جو پلاؤ وہی میرا پانی ہے جو کھلاؤ وہی میری غذا ہے جو پہناؤ وہی میرا لباس ہے اسی طرح اس بازاری عورت کے لئے وہ عاشق ڈاڑھی پر ہنسنے والوں سے کہہ دے گا کہ میاں اسے تو پسند ہے۔ تم بلا سے برا سمجھتے رہو تم سے مجھے لینا کیا ہے حضرت یہی مذہب ہوتا ہے عاشق کا ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان   مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے۔ لیکن ہم ننگ و ناموس کے خواہاں نہیں)۔

مگر اس سے پہلے اس کی ضرورت ضرور ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را   خاک بر سر کن غم ایام را

(اے ساقی جام چھوڑ کر اٹھ جا اور گذرے ہوئے ایام کی یاد دل سے نکال دے!)

یعنی جام محبت پینے کے بعد یہ مذہب نصیب ہوجاتا ہے۔ اس سے ہی تمام شبہات خدشات تمام سوالات تمام اشکالات رخصت ہوجاتے ہیں اور نری قیل وقال سے کچھ نہیں ہوتا آج کل قیل وقال اور بحث وجدال وہ بھی محض فضول ولاطائل کا ایک مستقل شغل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک بڑے تعلیم یافتہ فرماتے تھے کہ فروری میں روزے مقرر ہوتے تو بہت مناسب تھا گرمی کے دنوں میں جو روزے آجاتے ہیں بڑی مصیبت آجاتی ہے اللہ اکبر کچھ حد ہے ۱۶ گھنٹے تک پیاسا رہنا پڑتا ہے اس دشمنِ عقل نے یہ نہ سمجھا کہ فروری کے مہینہ میں تمام اقلیموں میں تو دن چھوٹا نہیں ہوتا۔ اب تو نری سختی سب کو بانٹ رکھی ہے۔ نمبر ۲ بھکتو مگر اس سے بھی قطع نظر کرکے کہتے ہیں کہ ہم کو ضرورت ہی کیا اعتراض کرنے کی جو چاہا اللہ میاں نے مقرر کردیا اگر اس معترض کے قلب میں محبت ہوتی تو اعتراض کا اس میں گذر تک نہ ہوتا۔ ایک مجمع تھا تعلیم یافتوں کا اس میں میں نے یہ مضمون بیان کیا تھا کہ خدا سے محبت پیدا کرلو سارے شبہات جاتے رہیں گے خدا کی قسم یہی اصل علاج ہے شبہات کا کیونکہ قاطع وساوس صرف محبت ہے اور کوئی چیز نہیں۔ نہ دلائل میں نہ براہین میں نہ لکچر میں نہ تقریر ہے نہ وعظ ہے۔ بس شبہات کی جڑ جو کٹتی ہے تو محبت سے ہی۔ فرض کرو ایک بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہوگئے جن کے پاس کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے نکٹائی بھی ہے اس نے ان کے لئے ایک ایسی پوشاک تجویز کی جس میں سوائے ناک کٹائی کے اور کچھ بھی نہیں یعنی اس نے کہا کہ میں جب ملوں گی جب اپنے یہ سب کپڑے اتار کر اور صرف ایک لنگوٹا باندھ کر ایک بازار سے دوسرے بازار تک ننگ دھڑنگ دس چکر لگا آؤگے اگر عاشق ہے تو اس سے بھی زیادہ پر آمادہ ہوجائے گا اور یہی نہیں بلکہ شبہ بھی نہ ہوگا حالانکہ شبہ تو ہونا چاہئے تھا کہ کیوں بی اس میں تمہارا کیا نفع میری تو رسوائی اور تمہارا کچھ نفع نہیں۔ جیسے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے نماز نہ پڑھی تو اللہ میاں کا کیا بگڑا مگر یہاں کوئی نہیں بولتا۔ اتفاق سے ایک بڑے عاقل تھے بڑے فلسفی تھے۔ آپ پوچھتے ہیں بی مجھے رسوا کرنے میں تمہارا کیا بھلا ہو

گا۔ وہ کہتی ہے کہ خیر اگر تمہیں یہ رسوائی گوارا نہیں تو جاکر گھر بیٹھو اب خوشامدیں کر رہے ہیں کہ نہیں نہیں خفا مت ہو میں نے تو یوں ہی حکمت دریافت کرلی تھی ورنہ مجھے حکمت معلوم کرکے کیا لینا مجھے تو تمہاری رضامندی چاہیئے۔ تو جناب اس مردار کے کہنے میں اوّل تو شبہ ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو اس سے فوراً رجوع کرکے عمل کرنا شروع کردے گا تو وجہ فرق کی کیا۔ وجہ فرق کی یہ ہے کہ اس کمبخت سے محبت ہے اور اللہ میاں سے محبت نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا اس شخص کو مشورہ بھی دے کہ میاں یہ تو نہایت واہیات اور بیہودگی کا کام ہے اس کی حکمت اور مصلحت تو پوچھ لی ہوتی۔ تو وہ یہی کہہ دے گا کہ میاں جاؤ یہ کوئی پوچھنے کا موقع ہے یہ تو فنا کا موقع ہے جو کچھ کرنا چاہیئے۔ ہائے ہائے یہ مذہب ہمارا خدا کے ساتھ کیوں نہیں۔ خلاصہ یہ کہ

ہائے ہائے یہ مذہب ہمارا خدا کے ساتھ کیوں نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خدا کے ساتھ محبت نہیں ہے ورنہ کوئی حکم گراں نہ معلوم ہوتا ساری کم ہمتی اسی سے ہے کہ محبت نہیں ہے۔ اگر وسوسے دور کرنے ہیں تو محبت پیدا کرلو۔ پھر یہ شبہ پیدا نہ ہوگا کہ اگر ہم اپنے آپ کو حق تعالےٰ کے سپرد کردیں گے تو کام اٹکے گا۔ اوّل تو ہر جگہ یہ سوال نہیں ہوسکتا مثلاً داڑھی رکھنے میں کون سا کام اٹکتا ہے۔ اگر کہیں کہیں یہ شبہ ہو بھی سکتا ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے روٹیاں نہ ملیں گی تنگی پیش آئے گی تو اس کا شبہ ایک جواب تو یہ ہے کہ محبت پیدا کرلو اگر محبت پیدا کرلو گے تو خدا کی قسم تمہارا یہ مذہب ہوجائے گا کہ ع

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

جان جیسی پیاری چیز بھی دینے پر تیار ہوجاؤ گے۔ حضرت اب اس سے تو بڑھ کر کوئی چیز نہیں کیرانہ میں ایک طالب علم اسی مشرب کے مولانا فتح محمد صاحب سے مثنوی شریف پڑھنے آتے تھے انھوں نے ایک سوال کا ایسا ہی جواب دیا تھا اور وہ عاشقانہ جواب ہے۔ اور ایک اور بھی ہے جسے میں بعد کو عرض کروں گا صرف اسی عاشقانہ جواب پر اکتفا نہ کروں گا کبھی کوئی یوں کہنے لگے کہ یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں۔ مولوی لوگ ہی ایسی ہمت کرسکتے ہیں۔ بہرحال

مولوی صاحب نے اس طالب علم سے پوچھا کہ بھائی روٹیوں کی کیا فکر کروگے۔ اس نے کہا اجی مولوی صاحب روٹیوں کی کیا فکر ہے اللہ میاں کی جان ہے۔ اگر وہ اسے دنیا میں رکھنا چاہیں گے خود روٹیاں دیں گے اور اگر نہیں دیں گے اپنی جان لے لیں گے۔ یہ آخر کبھی نہ کبھی تو نکلے ہی گی اس کی کیا فکر۔ چھوڑیئے اس قصہ کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ مرنے پر تیار ہو گئے کہ کبھی نہ کبھی تو مریں ہی گے ابھی سہی۔ جیسے کسی ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے تھے اس نے کہا دریا میں۔ پوچھا دادا۔ کہا دریا میں۔ کہا میاں تمہیں ڈر نہیں معلوم ہوتا کہ اتنے تو تجربے ہو چکے ہیں پھر بھی تم یہیں نوکری کرتے ہو۔ اس وقت تو اس نے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ صاحب کیا کریں باپ دادا سے یہی پیشہ چلا آتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اس سے پوچھا کہ آپ کے والد صاحب نے کہاں انتقال فرمایا تھا کہا گھر میں کہا دادا صاحب نے کہا گھر میں۔ پوچھا پردادا صاحب نے کہا گھر میں۔ کہا پھر آپ کو ڈر نہیں معلوم ہوتا کہ جس گھر میں آپکے اتنے بزرگ مرتے چلے آرہے ہیں اسی میں آپ رہتے ہیں حاصل یہ کہ مرنا تو ہے ہی دریا میں مرے تب کیا۔ اور گھر میں مرے تب کیا اور مصر و شام میں مرے تب کیا۔ اسی طرح فاقہ میں مرے تب کیا تو اس طالب علم کا یہ مذہب تھا۔ صاحب کچھ استغنا میں اثر ہوتا ہے۔ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی ایک صاحب مولوی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جو یہ گفتگو سنی تو ان پر اثر ہو گیا۔ سمجھے کہ یہ تو بڑا اچھا آدمی ہے۔ ان کا جی چاہا کہ کچھ خدمت کروں۔ کہا مولوی صاحب آج میرے یہاں آپ کی دعوت ہے۔ مولوی صاحب نے کہا اچھا بھائی مگر میں مکان پر نہ آؤں گا میرا حرج ہوگا۔ اگر کھلانا ہو تو کھانا یہیں بھیج دینا۔ اب آپ نے اس میں بھی نخرے شروع کئے حالانکہ دعوت کا عموماً یہ دستور ہے کہ مہمان خود میزبان کے گھر جا کر کھانا کھاتا ہے لیکن ان کے عذر کو بھی قبول کر لیا گیا کہ اچھا صاحب ہم یہیں کھانا حاضر کر دیں گے پھر تو جناب اس واقعہ کا قصبہ بھر میں چرچا ہو گیا کہ یہ طالب علم ایسے ہیں۔ بڑے سیر چشم ہیں۔ پھر تو صبح بھی دعوت شام بھی دعوت اور دعوت کا کھانا عموماً روزمرہ کے کھانے سے اچھا ہوتا ہے۔ غرض خوب دعوتیں اڑائیں۔

جتنی مثنوی پڑھی یار دعوتیں ہی اڑاتے رہے۔ جب پڑھ چکے السلام علیکم کہہ کر یہ حاضر ہوئے میں پوچھتا ہوں اوس کو کہاں سے روٹیاں مل گئیں لیکن اس جواب کو جو آزاد ہوگا وہ تو قبول کرلے گا۔ اور جو آزاد نہ ہوگا وہ کہے گا کہ واہ صاحب واہ اچھی رائے دی۔ اور جو کوئی نہ پوچھے تو بھوکوں ہی مرجاؤ۔ جیسے ایک واعظ بے چارے یہ بیان کر رہے تھے کہ پلصراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ ایک فارسی صاحب بھی کہیں وعظ میں بیٹھے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ملا صاف بگو کہ راہ نیست۔ مولوی صاحب پھر صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہاں چلنے کا راستہ ہی نہیں اس ایر پھیر سے کیا حاصل کہ تلوار سے بھی تیز بال سے بھی باریک یوں کہو کہ وہاں چلنے کا راستہ ہی نہیں۔ اسی طرح میرے اس جواب کو سن کر آپ صاحبان دل میں کہتے ہوں گے کہ مولوی صاحب نے اچھی رائے دی پھر سب کو زہر دے کر اور گلا گھونٹ گھونٹ کر ہی کیوں نہ ختم کر دو۔ ترس ترس کر مرنے سے تو یہی اچھا کہ ایک دم سے جان نکل جائے۔ اچھی رائے دی صاحب کہ تجارت اور کاروبار سب چھوڑ کر بیٹھ رہیو اور بس مر رہیو۔ کوئی نہ کوئی دفن کر ہی دے گا بھائی ہماری سمجھ میں تو یہ جواب آیا نہیں۔ سو دوسرا جواب اور بھی ہے مگر وہ بھی پسند آئے گا۔ وہ یہ کہ شان و شوکت کو چھوڑ دو اور کوئی ایسا کام جو حلال ہو اس کو اپنا ذریعۂ معاش بناؤ یہ کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔ دیکھو حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام زرہ بنایا کرتے تھے جو لوہار کا کام ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ ڈپٹی کلکٹر ہی ہو جاویں ملک التجار ہی ہو جاویں ملک النجار ہی سہی۔ نجار پہ یاد آیا۔ حدیث شریف میں ہے کَانَ زَکَرِیَّا نَجَّارًا حضرت زکریا علیہ السلام نجار تھے یعنی بڑھئی کا کام کیا کرتے تھے۔ مردوں کو انبیاء علیہم السلام کی تقلید سے عار نہ آنی چاہیئے اور عورتوں کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تقلید کو اپنا فخر سمجھنا چاہیئے جو باوجود اس کے کہ صاحبزادی تھیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم شاہِ دو عالم کی لیکن چکی پیسا کرتی تھیں یہاں تک کہ آپ کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تھے۔ ایک روز حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ سنا ہے کچھ غلام

لونڈی تقسیم ہونے کے لئے آئے ہیں تم بھی گھر کے کام کاج کے لئے کوئی لونڈی اپنے اباسے مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دولت خانہ پر حاضر ہوئیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں ان سے کہہ کر چلی آئیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واپسی پر اطلاع ملی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مکان پر خود تشریف لائے اور آکر حضرت فاطمہؓ کے پاس بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد کا وقت تھا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا لیٹی ہوئی تھیں وہ اٹھنے لگیں آپؐ نے فرمایا لیٹی رہو۔ آخر صاحبزادی تھیں بے تکلف لیٹی رہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیسے آئی تھیں کیا کام تھا۔ اب وہ تو مارے شرم کے کچھ عرض نہ کرسکیں چپ رہیں۔ اس قدر شرماتی تھیں کہ دنیا کے نام لینے کی بھی ہمت نہ ہوئی آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو مقصد تھا! عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ لونڈی دوں یا اس سے بھی اچھی چیز دوں۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کے واسطے کیا اختیار کیا حضرت فاطمہ بولیں کہ حضرت اچھی چیز سب مانگتے ہیں میں بھی اچھی چیز ہی مانگتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوتے وقت سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ اکبر تینتیس تینتیس بار پڑھ لیا کرو۔ بس اس پر راضی ہوگئیں۔ بھلا اب تو کسی عورت کو راضی کرلو کہ سونے کے کڑوں کا کیا کروگی۔ یہ تسبیح پڑھ لیا کرو۔ بیوی صاحبہ یہی کہیں گی کہ واہ جی واہ میں تو سونے کے کڑے ہی لوں گی بھلا ان کو تو راضی کرلو اللہ اکبر کیسی صاحبزادی تھیں اس بناء پر میں تو یہی کہتا ہوں عورتوں سے چکی پیسوا در شان کو چھوڑو۔ کہاں کی شان یہ ہے جواب مگر اخیر درجہ میں ایک اور جواب بھی عرض کرتا ہوں جس میں شان بھی نہ جائے گی اور آمدنی بھی نہ گھٹے گی وہ یہ ہے کہ بھائی جو کچھ کمارہے ہو کماؤ اور جس حالت میں ہو اسی میں رہو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ گناہ کی اجازت دیتا ہوں بلکہ میں توبہ صادقہ کو چندے ملتوی کرتا ہوں تاکہ اگر کامل اصلاح نہ ہوا ورنہ سہی تو گڑدر گڑ تو نہ رہے۔ کچھ تو تیر رہو۔ اگر دوا نہیں پیتے پرہیز ہی کرلو۔ اگر پرہیز بھی نہیں ہوتا تو دستوں کی دوا

ہی کھالیا کرو اور اگر اس کے کھانے سے بھی گریز ہے تو پھر اپنی ایسی تیسی میں جاؤ۔ بھائی اگر مریض ہو کم ہمت تو اس کی اتنی رعایت تو خیر طبیب مشفق کرسکتا ہے کہ دوا کے استعمال کو کچھ دن کے لئے ملتوی کرے اور فی الحال کوئی ایسی ہی تدبیر بتادے جس سے مرض نہ بڑھے لیکن اس تدبیر کے استعمال میں کچھ تو تغیر اپنی موجودہ حالت میں کرنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا فی الحال میں بھی ایک ایسی بات عرض کرتا ہوں کہ جس سے نہ آپ کی تجارت کا کچھ نقصان ہو نہ آپ کی آمدنی کچھ گھٹے نہ آپ کی شان و شوکت میں کچھ فرق آوے اور گو اس سے صحت نہ ہوگی مگر مرض بھی نہ بڑھے گا پھر انشاء اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وقت آپ کا کام بھی بن جاوے گا اور صحت بھی ہو جاوے گی انشاء اللہ میں ایک ایسا نمک دست آور بتائے دیتا ہوں کہ جس میں دنیا کا حرج تو مطلق نہیں اور دین کا نفع انشاء اللہ یقینی گو کامل نہ سہی مگر عدم سے وجود غنیمت ہے وہ نمک یہ ہے کہ دن بھر تو گو کھاتے رہو جیسا کھارہے ہو لیکن سوتے وقت یہ کرو کہ مسجد میں نہیں بلکہ لیٹنے کی جگہ جہاں خلوت ہو بلکہ چراغ بھی گل کردو تاکہ کوئی دیکھے نہیں اور کرکری نہ ہو دو رکعت نفل نمازِ توبہ کی نیت سے پڑھ کر یہ دعا مانگو کہ اے اللہ! میں آپ کا سخت نافرمان بندہ ہوں۔ میں فرمانبرداری کا ارادہ کرتا ہوں مگر میرے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا اور آپ کے ارادہ سے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو۔ مگر ہمت نہیں ہوتی۔ آپ ہی کے اختیار میں ہے میری اصلاح۔ اے اللہ میں سخت نالائق ہوں۔ سخت خبیث ہوں سخت گنہگار ہوں۔ میں تو عاجز ہورہا ہوں آپ ہی میری مدد فرمایئے میرا قلب ضعیف ہے۔ گناہوں سے بچنے کی قوت نہیں آپ ہی قوت دیجئے۔ میرے پاس کوئی سامانِ نجات نہیں۔ آپ ہی غیب سے میری نجات کا سامان پیدا کردیجئے۔ ایک دس بارہ منٹ تک خوب استغفار کرو اور یہ بھی کہو کہ اے اللہ جو گناہ میں نے اب تک کئے ہوں انھیں تو اپنی رحمت سے معاف فرمادے۔ گو میں یہ نہیں کہتا کہ آئندہ ان گناہوں کو نہ کروں گا میں جانتا ہوں کہ آئندہ پھر کروں گا لیکن پھر معاف کرالوں گا۔ غرض

اس طرح سے روزانہ اپنے گناہوں کی معافی اور عجز کا اقرار اور اپنی اصلاح کی دعا اور اپنی نالائقی کو خوب اپنی زبان سے کہہ لیا کرو کہ میں ایسا نالائق ہوں ایسا خبیث ہوں میں ایسا بُرا ہوں غرض خوب بُرا بھلا اپنے آپ کو حق تعالےٰ کے سامنے کہا کرو۔ صرف دس منٹ روزانہ یہ کام کر لیا کرو۔ لو بھائی دوا بھی مت پیو بد پرہیزی بھی مت چھوڑو صرف اس تھوڑے سے نمک کا استعمال سوتے وقت کر لیا کرو۔ حضرت آپ دیکھیں گے کہ کچھ دن بعد غیب سے ایسا سامان ہوگا کہ ہمت بھی قوی ہو جائے گی۔ شان میں بھی بٹہ نہ لگے گا دشواریاں بھی پیش نہ آئیں گی۔ غرض غیب سے ایسا سامان ہو جاوے گا کہ آج آپ کے ذہن میں بھی نہیں ہے۔ اچھا اب یہ بھی کوئی مشکل طریقہ اصلاح کا ہے اس طریقہ پر کس کا اعتراض ہو سکتا ہے اس پر عمل کرنے کے بعد کوئی دکھلاتے کہ اس میں یہ خرابی ہے یہ دشواری ہے میں تب جانو۔ غرض کچھ تو کرو اس پر تو صبر نہیں ہوتا کہ اسلام کے سامنے نہ فانی میں نہ آرزو ہے فنا کی۔ بھائی اگر فنا نہیں ہوتیں تو ہو فنا کی یہ ہوس بھی انشاء اللہ خالی نہ جائے گی۔ حضرت اور کچھ نہیں اتنا فائدہ ضرور ہوگا اگر روز کے روز معافی نہ چاہتے رہے تو جرائم بڑھتے چلے جائیں گے اور سزا قوی ہوتی چلی جائے گی اور اگر روز کے روز معافی چاہتے رہے تو گناہوں کا بوجھ تو ہلکا ہوتا رہے گا پھر جتنا رہ جائے گا وہ شاید مرتے وقت توبہ سے جاتا رہے ایک عزیز خدا نہ کرے دس جرموں کا مجرم ہو اور پیروی کرنے سے وہ نو جرموں سے بری ہو سکتا ہے گو ایک میں پھنس جانے کا خوف غالب ہو تو کیا کوئی عاقل یہ کہے گا کہ جب سزا ہی سے نہ بچا تو پھر ضرورت ہی کیا ہے پیروی کی۔ یا جتنی تخفیف سزا میں ہو سکے گی اسی کو غنیمت سمجھے گا اسی طرح اے صاحب جو تدبیر تعزیرات الٰہیہ سے بچنے کی آسانی کے ساتھ ہو سکے اس کو تو اختیار کیجئے اگر رہائی کی تدبیر نہیں کر سکتے تخفیف کی تو تدبیر آسان ہے اسی کو کیجئے خلاصہ مطلب یہ ہے میرا کہ اگر حق تعالےٰ سے اطاعت کا تعلق نہیں ہے تو معذرت ہی کا تعلق سہی۔ کچھ تو تعلق ہو۔ ایسی بھی غفلت کیا کہ فکر ہی نہیں کرتے سوچتے ہی نہیں کروٹ ہی نہیں لیتے صاحب

یہ حالت تو ہم سے نہیں دیکھی جاتی اسے تو بدلو۔ کچھ تو تغیر اپنی حالت میں کرو۔ خلاصہ دستور العمل کا یہ ہے کہ جو کام جی میں آوے اوّل سوچو۔ فوراً مت کر لیا کرو۔ بلکہ سوچا کرو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہو کرو۔ اگر ناجائز ہو اوّل چھوڑنے کا قصد کرو۔ اگر نفس کہے کہ اس کے چھوڑنے میں تکلیف ہے تو دیکھو کہ وہ تکلیف قابلِ برداشت ہے یا نہیں اگر قابلِ برداشت ہے سہہ لو اگر نہیں ہے تو خیر جہاں مبتلا ہو رہے ہو وہاں اتنا تو کرو کہ رات کو استغفار اور دعا نجات کی کرو۔ یہ ہوا خلاصہ دستور العمل کا اور یہ ہے اسلام کا پہلا سبق اس سے عمل کی توفیق ہوگی پھر عمل کی برکت سے علوم حاصل ہونگے پھر ان علوم سے اسلام کی تکمیل ہو جائے گی اور جب خلاصہ تقریر کا یہ ہوا کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز اب ضرورت ہوگی تلاش احکام کی۔ پھر اس کی آسان صورت یہ ہے کہ ہر روز کچھ کچھ مسئلے جاننے والوں سے پوچھتے رہا کرو اسی طرح دروازے کھٹکھٹاتے کھٹکھٹاتے کھلنے شروع ہو جائیں گے اس طور سے تھوڑے دنوں میں بہت دور نکل جاؤ گے اور خبر بھی نہ ہوگی تھکو گے بھی نہیں۔ یہ جو مضمون میں نے بیان کیا ہے ظاہر میں معمولی سا ہے لیکن میں اسی پر فخر کرتا ہوں کہ ایسا مضمون قلب میں آیا جو کام کا سنوارنے والا ہے گو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی جگہ میں تنگی اور دشواری نہیں پیش آنے دی تو صاحبو اسلام کا سبق تو شروع کرو پھر انشاء اللہ ترقی ہوتے ہوتے اسلام حقیقی نصیب ہو جائے گا پھر دیکھو گے کہ دنیا ہی میں اس حدیث کے معنے سمجھ میں آجاویں گے اور اس حدیث میں جو جنت کی کیفیت مذکور ہے وہ دنیا ہی میں نظر آجائے گی۔ حدیث یہ ہے اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔ یہ حدیث قدسی ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی کی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کے کان نے سُنیں۔ نہ کسی کے دل پر کبھی گذریں۔ صاحبو میں کہتا ہوں دنیا ہی میں آپ کو اس کا نمونہ نظر آجائے گا جب آپ یہ تیر اختیار کر لیں گے تو اس کے چند ہی روز بعد وہ کیفیت پیدا ہوگی کہ آپ دیکھ کر حیرت کریں گے کہ یہ تو کبھی ہمارے ذہن میں نہ آئی تھی۔

کبھی دیکھا سنا بھی نہ تھا واللہ وہ وہ باطنی نعمتیں حاصل ہوں گی کہ ہر وقت اطمینان اور راحت اور بشاشت اور سلطنت باطنی میں زندگی بسر ہونے لگے گی اس وقت آپ کہیں گے کہ بادشاہوں کی بھی زندگی اس زندگی کے سامنے ہیچ ہے۔ اس وقت نہ کوئی تکلیف تکلیف معلوم ہوگی نہ کوئی کلفت کلفت یہاں تک کہ موت جو سب میں ڈراؤنی چیز ہے یہ بھی محبوب معلوم ہونے لگے گی جیسا کہ ان کو معلوم ہوئی جن کے منہ سے یہ نکلا ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم | راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہے کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جان کو آرام مل جاتے اور محبوب کے پاس پہونچ جاؤں)۔

موت کی تمنا کرتے ہیں کہ کیا ہی خوشی کا وہ دن ہوگا کہ اس منزلِ ویراں یعنی دنیا سے محبوب حقیقی کی طرف روانہ ہوں گے۔ اس وقت اگر کوئی کلفت یا بیماری بھی پیش آوے گی تو وہ ایسی معلوم ہوگی کہ جیسے آپ کسی محبوب پر عاشق ہوگئے ہوں اور وہ آپ کو منہ بھی نہیں لگاتا ہو اتفاق سے مدتوں بعد اس کو رحم آگیا اور وہ خود ہی آیا آپ کو تلاش کرتا ہوا آکر پیچھے سے دفعتہً بے خبری میں ایسے زور سے دبایا کہ آپ کی ہڈی پسلی بھی ٹوٹنے لگیں۔ جب تک خبر نہیں تھی کہ کون ہے اس وقت تو نہایت تکلیف محسوس ہو رہی تھی لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہ محبوب ہے جو کبھی منہ بھی نہ لگاتا تھا۔ آج یہ میری قسمت کہ خود آکر ہم بغل ہو رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کیا اب بھی آپ کو وہ تکلیف محسوس ہوگی جو پہلے ہو رہی تھی کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی تھی۔ وہ محبوب قوی ہے تم ضعیف ہو اس کے زور سے دبانے سے یہ ضرور ہے کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی ہیں مگر ذرا دل میں سوچ کر دیکھو کہ وہ تکلیف کیا اب بھی تکلیف ہے یا راحت ہے بدن کو تو بے شک تکلیف ہے لیکن دل کو وہ راحت پہونچ رہی ہے کہ روئیں روئیں میں گویا جان آرہی ہے۔ اب وہ محبوب کہتا ہے کہ اگر تمہیں میرے دبانے سے تکلیف ہو رہی ہو تو میں تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دبانے لگ جاؤں۔ کیونکہ یہ رقیب

بھی اس تمنا میں ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھے بغل میں لے لو۔ اس وقت یہ عاشق کہے گا جو حضرت عراقی کہتے ہیں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت | سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے۔ دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر چلے)۔

اور یہ کہے گا اس وقت ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من | دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ دل ایسے یار پر قربان جو میرے دل کو رنجیدہ کرے)

اے میری جان تم کہتے ہو تکلیف میں کہتا ہوں تمہاری تکلیف بھی مجھے راحت ہے ؎

ناخوشِ تو خوش بود بر جان من | دل فدائے یار دل رنجان من

کیونکہ عاشق کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو | دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں تو آپ کی عطا اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہوں۔ دل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں)

پھر تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تکلیفیں تو اب تکلیف نظر آرہی ہیں پھر وہ تکلیفیں بھی راحت ہو جائیں گے اس وقت وہ درجہ حاصل ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ درجہ ابھی حاصل نہیں ہے اس لئے سہل کر دیا ہے میں نے رستہ کی ایسی بات بتائی ہے جس میں تکلیف ہی نہ ہو جس میں سہولت ہی سہولت ہو۔ یعنی دن بھر گناہ ہونے کے بعد رات کو حق تعالیٰ سے دعا اور استغفار کر لیا کرو جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا مگر ایک چیز کی اور ضرورت ہوگی وہ یہ ہے کہ میں نے ایک تخم پاشی یعنی بیج ڈالنے کی ترکیب بتائی ہے میں نے ایک چھوٹا سا بیج ایسا بتایا ہے کہ جس کی کاشت بہت آسان

ہے لیکن جیساکہ تخم پاشی کے بعد آب پاشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر پانی نہ دو وہ بیج پھوٹتا اور بڑھتا نہیں اسی طرح اس میں بھی ایک چیز کی اور ضرورت ہے اور وہ بھی آسان نہ ہے یعنی اللہ والوں کی صحبت خدا کے ان مقبول بندوں کی صحبت جن کو یہ درجہ نصیب ہو چکا ہے۔ یہ آب پاشی ہے اسی تخم پاشی کے بعد مگر اس میں جانچ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہر شخص کو دیکھ کر عاشق نہ ہو جانا۔ یعنی لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مذاق بگڑا ہوا ہے آج کل بہت سے سیاح پھرتے ہیں اور لوگوں کو پھانستے پھرتے ہیں۔ اور لوگوں کی بھی یہ حالت ہے ؎

لختے برد از دل گذرہ دہر کہ ز پیشم　　　　من قاش فروشِ دلِ صدپارہ خویشم

(میرے سامنے سے ہر گذرنے والا دل کا ایک ٹکڑا لے جا رہا ہے۔ میں
اپنے دل صدپارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں)۔

ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہ چاہیئے۔ ہر شخص اللہ والا نہیں ہے بلکہ اُس کی کچھ پہچان بھی ہے اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ سب سے اوّل دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت کا بھی پابند ہے دوسرے یہ کہ دنیا کا لالچ تو اس میں نہیں۔ یہ پہچانیں۔ میں اس لئے بتلائے دیتا ہوں کہ دھوکہ میں نہ آویں رہزن کو رہبر نہ سمجھ لیں۔ تیسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس کی صحبت میں یہ دیکھے کہ دنیا کی محبت کتنی گھٹی حق تعالیٰ کی محبت کتنی بڑھی چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے پاس رہنے والوں میں سے اکثر کی حالت باتمیاز ترک معاصی و تقویٰ و اہتمام حلال و حرام کے کیسی ہے پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو روک ٹوک بھی کرتا ہو چھٹی علامت یہ ہے کہ یہ ضرورت کے موافق علم دین رکھتا ہو اور علماء سے محبت رکھتا ہو ساتویں علامت یہ ہے کہ اہلِ علم و صلاح بہ نسبت عوام کے اس کی طرف زیادہ مائل ہوں اگر یہ علامتیں موجود ہیں تب تو وہ صحبت کے قابل ہے ورنہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　　پس بہ ہر دستے نباید داد دست

(یعنی بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان زمین پر بستے ہیں اس لئے
ہر کس و ناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ بنے)

اور اس زمانہ میں بالخصوص اس شخص کے ظاہری اعمال کے صالح ہونے پر نظر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ بعض بدعقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ بس صاحب اہل باطن ہونا چاہیئے نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے صرف خدا کی یاد اپنے قلب کے اندر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس دھوکہ میں ہرگز نہ آنا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر انارے میخری خنداں بجز　　　　تا دہد خندہ اش ز دانہ او خبر

آہ کیا عمدہ طریقہ تعلیم فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو وہ تو بڑے عارف ہیں کہتے ہیں کہ انار خریدو تو بند محض نہ خریدو بلکہ کھلا ہوا خریدو ؎

نا مبارک خندہ آں لالہ بود　　　　کہ ز خندہ او سواد دل نمود

یعنی ایک خندہ تو ہے انار کا جس سے اس کا نفیس ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں یہ صاحب باطن ہے کیونکہ اعمال صالحہ کا صدور اعتدال و استقامت کے ساتھ بدون اصلاح منشا یعنی باطن کے نہیں ہو سکتا۔ اور ایک خندہ ہے لالہ کا اوپر ہی سے اندر کی سیاہی نظر آتی ہے اسی طرح اعمال فاسدہ سے باطن کی سیاہی پر استدلال ہوتا ہے غرض خود اس کے اعمال بھی درست ہوں اور اس کی صحبت میں بھی یہ اثر ہو کر دوسرے کے اعمال بھی درست ہو جائیں اس شخص کی صحبت اکسیر اعظم ہے اور یہ جو میں نے اہل اللہ کی صحبت کو پانی سے تشبیہ دی ہے اس میں ایک اور بھی علمی فائدہ ہے وہ یہ کہ بعض لوگ فقط صحبت پر اکتفا کرتے ہیں خود عمل کچھ نہیں کرتے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے کھیت کے اندر سمندر کا سمندر کھینچ لے اور سارا دریا بہا لائے لیکن بیج نہ ڈالے تو اس میں کون سی چیز نکلے گی۔ سمندر کے اندر بیج تھوڑا ہی موجود ہے مطلب یہ کہ بیج تو ہو عمل اور پانی ہو صحبت اس وقت یہ حالت ہوگی جس کو حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً الآیہ اور آپ

دیکھیں گے کہ انشاء اللہ اس چھوٹے سے بیج سے وہ درخت نکلے گا کہ سارے عالم پر چھا جائے گا۔ پھر اس صحبت کے دو درجے ہیں اگر اہلِ حق کی صحبتِ حسیہ بھی میسر ہو۔ یہ تو بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اسی کو فرماتے ہیں مولانا ؎

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت ست　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

(نیک لوگوں کی ایک گھڑی کی صحبت سو سال کے زہد و طاعت سے بہتر ہے)

اور اسی طرح اہلِ حق کی صحبت کے مقابلہ میں اہل باطل کی صحبت کی یہ حالت ہے ؎

تا توانی دور شو از یار بد　　یار بد بدتر بود از مار بد

یعنی یار بد سانپ سے بھی بدتر ہے۔ کیوں ؎

مار بد تنہا ہمیں بر جاں زند　　یار بد بر جان و بر ایماں زند

(زہریلا سانپ تو جان ہی کو مارتا ہے۔ مگر برا دوست ایمان اور جان دونوں کو ختم کر دیتا ہے)۔

اور اگر اہلِ حق کی صحبت حسیہ میسر نہ ہو کیونکہ ہر شہر میں ایسے لوگ موجود نہیں ہوتے پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے خط و کتابت رکھو مگر خالی یہی نہیں کہ نوٹ بھیجو یا روپیہ بھیجو۔ یا خیریت منگاؤ یا بیٹے کے واسطے یا بیوی کے واسطے تعویذ گنڈے منگاؤ خیر یہ بھی سہی کبھی کبھی اگر دوسرے کام سے فرصت ہو۔ لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ جب لکھو اپنی بیماریاں لکھو اور اپنے معمولات لکھو کہ مجھ میں یہ یہ عیب ہیں یہ یہ کر رہا ہوں اب۔ آئندہ میں کیا کروں جیسے اگر طبیب کے پاس ہو تب تو سبحان اللہ اور اگر دور ہو تو خط میں جو حال ہو وہ لکھو اور جو نسخہ وہ تجویز کر کے بھیجے اُسے برتو۔ برتنے کے بعد پھر حال لکھو غرض دو چیزوں کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھو اطلاع اور اتباع یعنی احوال کی اطلاع اور اوامر کا اتباع۔ اسی طرح اتباع کے بعد پھر اطلاع پھر اس اطلاع کے بعد اتباع پھر اطلاع پھر اتباع غرض ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

(اس راستہ میں خوب کوشش کر۔ آخر دم تک بے کار مت رہ)

یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے۔ جب بیماری ساری عمر کی ہے تو علاج ساری عمر کا کیوں نہ ہوگا گو شتم پشتم ہی سہی حتیٰ کہ دو مہینے ہی میں ایک خط لکھو مگر لکھو ضرور اور یہ لکھتے ہوئے شرماؤ نہیں کہ وظیفہ جو بتایا تھا وہ چھوٹ گیا تھا یا مطالعہ کتب جو تجویز کیا تھا اسے نباہا نہیں یہاں تک کہ فرض نماز بھی فرض کرو قضا ہونے لگی ہو تب بھی شرماؤ نہیں بلکہ اب پھر پڑھنا شروع کر دو اور اطلاع کر دو شرماؤ اس رستہ میں ہرگز نہیں چاہیئے خواہ کیسی ہی گندی حالت کیوں نہ ہو جائے اس کی بھی اطلاع کر دو۔ ایک دریا تھا اس کے کنارے کے پاس سے ایک ناپاک آدمی گذرا دریا نے اس سے کہا کہ آ میں تجھے پاک کر دوں۔ اس نے کہا تو صاف و شفاف اور میں پلید و ناپاک میرا منہ کیا کہ میں تیرے پاس آؤں پاک ہو کر تیرے پاس آؤں گا دریا نے کہا بچہ جی پاک کروں گا بھی میں ہی اگر تم مجھ سے شرماؤ گے تو ساری عمر ناپاک ہی رہو گے بس ایک دفعہ بے حیا ہو کر آنکھیں بند کر کے میرے اندر کود پڑو۔ مجھ میں ایک موج اُٹھے گی اور تمہارے سر پر کو ہو کر اتر جائے گی اور تمہیں دم میں پاک صاف کر دے گی تو اہل اللہ سے اپنا کچا چٹھا کہہ دو۔ بہت سے لوگ اس لئے نہیں کہتے کہ ہماری شان گھٹ جاوے گی ارے ان کے نزدیک تیری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاوے گی بعضے ڈرتے ہیں کہ خفا ہو جائیں گے ارے ان کی خفگی بھی رحمت ہے یہ ساری تکبر کی باتیں ہیں ارے وہ پھانسی بھی دے دیں گے تو اس میں بھی تیری بہتری ہی ہوگی اس واسطے کہ ؎

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ　　شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی طرح اس کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ ہنستے کھیلتے اس کی تلوار کے سامنے جان دیدے)۔

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست　　نائب ست او دستِ او دست خداست

(جو جان دینے والا ہے وہ اگر مار ڈالے تو جائز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے
یہ فعل جائز ہے تو کبھی خود کرتے ہیں کبھی نائب سے کراتے ہیں)۔

؎ ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ   شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

تو اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ غرض خفگی وغیرہ کا بالکل خیال نہ کرو۔ بس اس طرح اس سے تعلق رکھو کہ اگر اس کی طرف سے خفگی ہو نکال دے پھر بھی تعلق قطع نہ کرو۔ وہ نکال دے تو تم مت نکلو اس وقت تو نکل جاؤ مگر پھر آجاؤ پھر نکال دے پھر نکل جاؤ پھر آجاؤ۔ پھر نکل جاؤ پھر آجاؤ غرض اسے چھوڑو مت وہ قصائی نہیں ہے وہ اگر سختی بھی کرتا ہے تو محض تمہاری مصلحت سے کیونکہ ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است   چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است
(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہیں۔ جس طرح فصد کھولنے والا کہ نشتر
بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

سیر کی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہوا کہ اے موسیٰ میرے ساتھ اس طرح رہو جس طرح بچہ ماں کے ساتھ رہتا ہے انھوں نے تفسیر پوچھی ارشاد ہوا کہ بچہ کو ماں مارتی ہے مگر وہ بچہ پھر اسی سے چپٹتا ہے مگر یہ علاقہ صرف اس سے رکھو جو واقعی اہل اللہ ہو لیکن چوں کہ یہاں سے ہر روز تو خط جاتا نہیں اور وہاں سے ہر روز خط آتا نہیں پھر اس درمیان میں کیا کرو یہ کرو کہ حکایات اور ملفوظات اہلِ تقویٰ کے مطالعہ میں رکھو بس خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہو اگر صحبت میسر نہ ہوسکے تو خط و کتابت کے ساتھ مطالعۂ کتب کا بہت غور سے کرو یہ اس کا بدل ہے ؎

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب   بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب
(چونکہ موسم گل ختم ہوگیا اور چمن اجڑ گیا۔ گلاب تو رہا نہیں جس سے خوشبو
حاصل ہو اب عرق گلاب سے ہی خوشبو حاصل کرو)۔

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش جز چراغ
(چونکہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اس لئے اس کی جگہ اب
چراغ ہی سے کام لو)۔

اسی طرح اگر اس کی مفارقت دنیا سے ہوجائے یا ہم سے ہوجائے یوں ہی کرنا چاہیے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی اگر آفتاب نہ ہو تو میاں چراغ ہی جلا لو۔ کیونکہ ہر جگہ تو آفتاب ہر وقت نہیں رہ سکتا تو خیر اس کا بدل سہی یہ نہ کرو کہ کھاؤں گا گھی سے نہیں جاؤں گا جی سے مطالعہ کتب کی نسبت فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست   صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل ست

نیز اگر شیخ کی صحبت میسر نہ ہو تو پیر بھائی بھی غنیمت ہے اس تعلق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مرید ہی ہوجاؤ۔ بس اپنے کو سپرد کردو۔ کیونکہ غلام بنے کسی کے صحبت اہلِ اللہ اور ان کے بجائے ان کے ملفوظات کے متعلق عارف شیرازی کی رائے مجھ کو بہت ہی پسند آئی۔ فرماتے ہیں ؎

مقام امن و مے بے غش و رفیقِ شفیق   گرت مدام میسر شود زہے توفیق

یعنی اطمینان کی جگہ اور ذکر و شغل اور کسی محقق اور مشفق شیخ کی صحبت ہمیشہ میسر رہے تو کیا بات ہے اگر یہ نہو تو پھر ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است   صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل ست

صراحیِ مے ناب ذکر اللہ ہے اور سفینۂ غزل ہو یہ ملفوظات ہیں بزرگوں کے۔ حضرات میں نے یہ ایک دستور العمل مختصر سا تجویز کردیا ہے جو کسی پر بھی دشوار نہیں اور اگر اس پر بھی عمل نہ کیا تو پھر میں یہ کہوں گا ؏

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

خوب سمجھ لیجیے محبت اللہ ختم ہو چکی ہے اب آپ کے پاس کوئی عذر نہیں رہا ہے خدا کے سامنے یہاں تک تو آپ کو نصیحت دیدی گئی کہ اگر عمل کی طرف توجہ نہیں ہے تو اس بے عمل کا اقرار اور توجہ پیدا ہونے کی دعا تو کر لیا کرو۔ یہ اخیر بات ہے اب اس سے آگے اور کیا چاہتے ہو۔ غرض یہ ہے اسلام کی تفسیر اور اسکی تکمیل کی تیسیر۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمت قویہ اور فہم سلیم عطا فرمائیں پھر ہاتھ اٹھا کر اس طرح دعا شروع کی اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی پھر آہستہ آہستہ دعا مانگتے رہے بعد ختم دعا حقر سے فرمایا ۱۲ کاتب) اس بیان کا نام ملت ابراہیم مناسب ہے کیونکہ مولوی صاحب (یعنی خطیب جامع مسجد مولوی محمد ابراہیم صاحب راندیری محرک سفر و وعظ ۱۲ کاتب) کا یہی نام ہے (اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ اتوار کے دن آٹھ بجے دن کو مدرسہ میں وعظ ہوگا)۔

مختصر کیفیت وعظ۔

الحمد للہ رنگون کا یہ پہلا وعظ جو نہایت زور و شور کے ساتھ ڈھائی گھنٹہ تک ہوتا رہا ختم ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ بہت زیادہ مجمع تھا جس کا تخمینہ زائد از دو ہزار کیا گیا سب لوگ نہایت متاثر تھے اور نہایت سکوت کے ساتھ سنتے رہے بعد وعظ بے حد اشتیاق کے ساتھ لوگوں نے مصافحہ کیا ایک دوسرے پر گرتا تھا۔ بڑی مشکل سے وار آتا تھا حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے تھے اور لوگ تھے کہ مشتاقانہ بڑھ بڑھ کر چوم رہے تھے اور پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے ایسے موقع پر حضرت پر ایک عجیب حالت انکسار اور تواضع کی طاری ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت دوران مصافحہ میں ہر شخص کی طرف نظر توجہ بھی ڈالتے جاتے تھے جیسا کہ دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہتا۔ غرض عجیب دلفریب منظر ہوتا ہے اور اس وقت حضرت پر ایک عجیب شانِ محبوبیت برستی ہے۔

ختم شد

۱۳۹

تقاریظ

از حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمدؐ زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم

باسمہ سبحانہٗ

عنایت فرمائے مولانا حکیم محمد اختر صاحب سلمہٗ بعد سلام مسنون۔ آپ کی دو کتابیں **معارف مثنوی** اور **دُنیا کی حقیقت** پہنچکر موجب منت ہوئیں۔ اس سے بہت مسرت ہوئی کہ آپ کا تعلق اولاً مولانا پھولپوریؒ سے اور آخراً مولانا ابرارالحق صاحب سے ہے اللہ تعالیٰ دونوں کے فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے اللہ تعالےٰ آپ کو اس ہدیہ سنیہ کا دونوں جہان میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ یہ دونوں کتابیں سُن بھی لیں۔ مضامین ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے۔ صدقہ جاریہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ **معارف شمس تبریز** کی طباعت کا بھی جلد از جلد انتظام فرمائے اور لوگوں کو ان معارف سے زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے۔ آپ کی دیگر تالیفات کی قبولیت کے لئے دُعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ ذخیرۂ آخرت بنائے اور اپنے وقت پر حسن خاتمہ کی دولت سے نوازے۔

(حضرت شیخ الحدیث) **محمدؐ زکریا** (دامت برکاتہم)

مدینہ طیبہ ۱۱/۵/۷۶ء

رائے عالی حضرت مولانا محمدؐ یوسف صاحب بنوری مہتمم مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی

وصدر مجلس تحفظ ختم نبوۃ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم محترم جناب مولانا حکیم محمد اختر صاحب کی تالیف لطیف معارف مثنوی پڑھکر موصوف سے اتنی عقیدت ہوئی جس کا مجھے تصور بھی نہ ہوسکتا تھا۔ فارسی اردو میں قدرۃ شعر حسن ذوق پاکیزگی خیالات دردِ دل کا بہترین مرقع ہے۔ اب موصوف نے دیوان شمس تبریز جو عارف رومی متکلم کے شیخ ہیں ان کے حقائق ومعارف کا انتخاب وتشریح وبیان لکھکر اپنے حسن ذوق۔ لطافت طبع سلامت فکر کا ایک اور شاہد عدل پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ ارباب ذوق کو انکے شگفتہ تالیفات وانتخابات سے مزید مستفید فرمائے۔ آمین

محمدؐ یوسف بنوری

سہ شنبہ ۸ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

منتخب اصلاحی اشعار

رہ کے دُنیا میں بشر کو نہیں زیبا غفلت
موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے

جو بشر آتا ہے دُنیا میں یہ کہتی ہے قضا
میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں ذرا دھیان رہے

نوٹ: یہ دو شعر مذکور حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے خاص حجرہ تھانہ بھون میں لکھے ہوئے تھے۔

لُطف دُنیا کے ہیں کے دن کے لئے
کھو نہ جنت کے مزے ان کے لئے

یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ
تو نے ناداں گل دیئے تنکے لئے

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بانداز بہار آئی ہے

جو چمن میں گذرے تو اے صبا تو یہ کہنا بلبلِ زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

"یہ ملتی ہے خدا کے عاشقوں سے"

(نظم بہ عنوان)

زبانِ عشق

از۔ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہٗ

درِ رازِ شریعت کھولتی ہے
زبان عشق جب کچھ بولتی ہے

خرد ہے محوِ حیرت اس زباں سے
بیاں کرتی ہے جو آہ و فغاں سے

جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پا سکتے نہیں دردِ نہانی

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

کہاں پاؤ گے صدرا بازغہ میں
نہاں جو غم ہے دل کے حاشیہ میں

مگر دولت یہ ملتی ہے کہاں سے
بتاؤں میں ملے گی یہ جہاں سے

یہ ملتی ہے خدا کے عاشقوں سے
دُعاؤں سے اور انکی صحبتوں سے

وہ شاہ دو جہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے

ارے یار و جو خالق ہو شکر کا
جمال شمس کا نور قمر کا

نہ لذت پوچھ پھر ذکر خدا کی
حلاوت نام پاک کبریا کی

بگویم زیں سبب ایں عشق بے باک
چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہ دولت درد اہل دل کی اختر
خدا بخشے جسے اس کا مقدر

تصانیف حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہ

- معارف مثنوی
- کشکول معرفت
- روح کی بیماری اوّل حصّہ
- معارف شمس تبریز
- روح کی بیماری دوم حصّہ
- معرفتِ الٰہیہ
- دنیا کی حقیقت
- مجالسِ ابرار اوّل حصّہ
- ملفوظات شاہ عبد الغنی پھولپوری
- مجالسِ ابرار دوم حصّہ
- صدائے غیب
- رسول اللہ کی نیتیں
- صحبتِ اہل اللہ اور اسکے فوائد
- دستور تزکیۂ نفس

کتب خانۂ مظہری کراچی

دنیا

کے لئے اتنی محنت کر جتنا کہ تجھے یہاں رہنا ہے۔

آخرت

کے لئے اتنی محنت کر جتنا کہ تجھے وہاں رہنا ہے۔

اللہ

کی رضا کے لئے اتنی کوشش کر جتنا کہ تو اس کا محتاج ہے

گناہ

اتنا کر جتنا کہ تجھ میں عذاب سہنے کی طاقت ہو

گلدستہ سنت

اپنی زندگی کے شب و روز کو سنت نبوی ﷺ
کی خوشبو میں بسانے کے لئے حسین گلدستہ
عام مسلمان اور دینی و عصری مدارس کے طلبہ کی دینی اور
اخلاقی تربیت میں بہترین معاون۔
مواد کی افادیت کے پیش نظر داخلِ نصاب کرنے کے قابل

تالیف
عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفسر و محدث دارالعلوم دیوبند

تسہیل، اضافہ، حاشیہ
مولانا محمد رضوان القاسمی

ناشر
کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال ۲، کراچی

"عجب وکبر کا علاج"

مرتبہ محمد اختر عفا اللہ عنہ

عجب :- اپنی نظر میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنا ہے۔

کبر :- اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر بھی سمجھنا اور حق بات کا قبول نہ کرنا اگر کوئی شخص اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھتا اور حق بات قبول کرتا ہے تو یہ دولت اور سلطنت اور شاندار لباس کے باوجود تکبر میں مبتلا نہیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد کمالات اشرفیہ میں ہے کہ بندہ جس وقت اپنے کو اچھا سمجھتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر میں بُرا اور حقیر ہوتا ہے اور جب اپنی نظر میں حقیر اور بُرا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھلا اور اچھا ہوتا ہے۔ عجب اور کبر کی بیماری بے وقوف اور بے عقل لوگوں کو ہوتی ہے۔ ایک لڑکی کو رخصتی کے وقت اسکی سہیلیوں نے خوب زیور اور اچھے کپڑوں سے سجا کر کہا بہن تمکو مبارک ہو کہ بہت اچھی معلوم ہوئی ہو وہ رونے لگی کہ نہ معلوم شوہر کی نظر میں ہمارا یہ حسن قبول ہوگا یا نہیں میرے حسن کا فیصلہ شوہر کے ہاتھ میں ہے تمہارے ہاتھ میں نہیں، گذارا تو شوہر کے ساتھ ہے اسی کی نظر کا فیصلہ اصل فیصلہ ہے۔ اس لڑکی سے بھی اس کی عقل خراب ہے جو اپنے مالک کے فیصلے سے قبل دنیا میں خود کو اچھا سمجھ رہا ہے اور چند انسانوں کی تعریف سے بے وقوف ہو گیا جبکہ قیامت کے دن کا فیصلہ باقی ہے جو اصل فیصلہ ہوگا اس سے قبل اپنے کو اچھا اور بڑا سمجھنا انتہائی بے عقلی اور بے وقوفی ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا عمدہ شعر کہا ہے۔ ؎

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے ⁂ وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

جو شخص لوگوں کی تعریف سے اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اسکی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کی رات دن کی شرارتوں سے تنگ آکر دلال کو

فروخت کرنے کے لئے دیا۔ دلال نے بازار میں اس گھوڑے کی خوب جھوٹی تعریفیں لوگوں کے سامنے سنانی شروع کیں، اس بے وقوف نے کہا کہ جب اس میں یہ خوبیاں ہیں تو ہم نہیں فروخت کرتے تمام عمر اس گھوڑے کی خباثت اور شرارت کا تجربہ بھول گیا۔ اسی طرح جو شخص اپنے نفس کی شرارتوں اور معاصی سے واقف ہے کسی کی تعریف سے اس کا اپنے نالائق نفس کو لائق سمجھنا نہایت درجہ کا گدھا پن اور حماقت ہے۔

عجب اور کبر کی بیماری سے انسان حق تعالیٰ کی شان کی رحمت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اپنی ہر صفت کو یعنی علم اور دولت اور حسن و جمال یا صحت کو حق تعالیٰ شانہٗ کا عطیہ سمجھنا چاہیئے اور اس کو اپنی ذاتی صفت سمجھ کر اس پر نظر کرنا ایسا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کے سامنے ایک آئینہ نکال کر اپنی ہی آنکھ ناک دیکھ رہا ہو تو ایسے عاشق کو اس کا محبوب دھکے دے کر نکال باہر کرے گا۔

عجب اور کبر کا مرض دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کرتا ہے۔

حدیث میں وارد ہے کہ :۔

جو اپنے کو مٹائے اور تواضع اختیار کرے تو حق تعالیٰ اسکو عزت اور بلندی عطا فرماتے ہیں۔ پس یہ اپنی نظر میں حقیر ہوتا ہے مگر مخلوق کی نظر میں باعزت اور کبیر ہوتا ہے اور جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ذلیل فرماتے ہیں پس وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتا ہے اور اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ مخلوق کی نظر میں وہ سور اور کتے سے بدتر ہوتا ہے۔ بیہقی

(از خطبات الاحکام حضرت تھانویؒ)

شائع کردہ
مجلس اشاعت الحق گلشن اقبال نمبر ۲ کراچی

مواعظِ ثلٰثہ

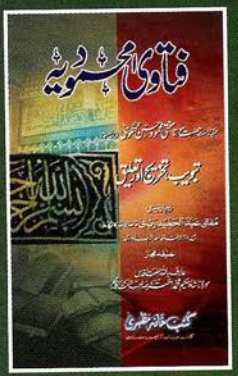

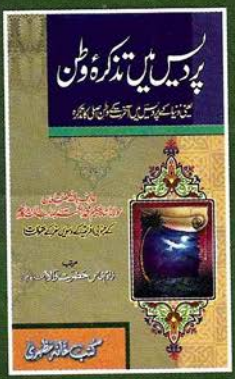

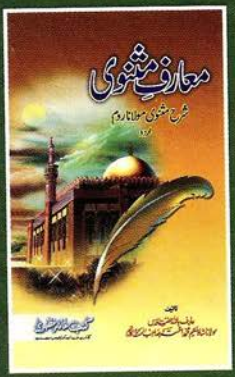

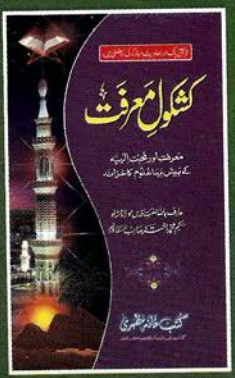

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کتب خانہ مظہری
گلشن اقبال کراچی پاکستان

COMET CREATIONS : 2767275